اقبال انسٹی ٹیوٹ، کشمیر یونیورسٹی، سری نگر کشمیر



مصنف

حکیم منظور

اقبال انسٹی ٹیوٹ، کشمیر یونیورسٹی

سری نگر

مصنف — حکیم منظور

تاریخ اشاعت — مارچ ۲۰۰۰ء

تعداد — پانچ سو

قیمت — تیس روپے

مطبع — شالیمار آرٹ پریس سری نگر

کمپیوٹر کتابت — T.F.C کمپیوٹرس سرینگر

سرورق — احمد

اقبال انسٹی ٹیوٹ کشمیر یونیورسٹی سری نگر



پیش گفتار

اقبال انسٹی ٹیوٹ کشمیر یونیورسٹی کے پیشِ نظر کثیر الجہات اور عظیم الشان اہداف و مقاصد ہیں جن کی تشکیل و تکمیل کی خاطر ادارہ اپنے وسائل کے مطابق پوری مستعدی سے کام کرتا رہے گا۔ اقبال کے افکار و نظریات کو ماہرینِ اقبالیات نے اعلیٰ ادبی اور فنی تناظر میں پیش کرنے کی قابل قدر مساعی کی ہیں، لیکن اقبال کے فکر، پیغام اور روح کو عوام کے دلوں میں منتقل کرنے کی کوئی ایسی باضابطہ کوشش نہیں ہوئی ہے، جس سے فکرِ اقبال عوامی دلچسپی کا معروف اور پسندیدہ موضوع بن جاتا۔ ہم نے اس ضرورت کو محسوس کرتے ہوئے اقبالیاتی ادب کے چند ماہرین اور معتبر تحقیق کاروں سے رابطہ کر کے اقبال کے افکار و نظریات پر مانوگراف لکھوانے کا منصوبہ بنایا ہے۔ یہ مانوگراف شاعرِ مشرق کے شخصی و نجی حالات و واقعات، تعلیم و تربیت، مغرب کے اثرات، اسلامی نظریات، انسان دوستی، خودی، بے خودی کے اسرار و معارف، عشق و خرد، تصوف و سلوک، قرآن پاک، ذاتِ رسالتمآبؐ اور دیگر متفرق عنوانات و موضوعات کا احاطہ کرتے ہوئے سادہ، سلیس اور عام فہم زبان میں چھپوا کر بڑے پیمانے پر تقسیم کیے جائیں گے۔

اس سلسلے میں پہلا مانوگراف اُردو کے جانے پہچانے شاعر جناب حکیم منظور کے زورِ قلم کا نتیجہ ہے۔ حکیم صاحب کو ماہرِ اقبالیات ہونے کا دعویٰ نہیں ہے لیکن جس اخلاصِ نیت کے ساتھ انہوں نے اقبال فہمی اور اقبال شناسی کا حق ادا

کیا ہے، وہ قابل صد تحسین و آفرین ہے۔ انہوں نے اُردو کے خوش بخت شاعر علامہ اقبال کی نسبت اپنا ردِ عمل ظاہر کیا ہے اور عقیدت و محبت کے پھول نذر کیے ہیں۔

منظور صاحب کی نثر نویسی کا اپنا انداز ہے اور ان کی شاعری کا جداگانہ اسلوب ہے۔ زیر نظر مانوگراف میں حکیم صاحب نے خوبصورت عنوانات کے تحت اقبال کی زندگی، شخصیت، فکر، فن اور حیات و ممات کے ضمن میں ان فکری پیمانوں کا احاطہ کرنے کی سعی بلیغ کی ہے اور ان سرچشموں کی وضاحت کی ہے، جن سے اقبال سیراب اور فیض یاب ہوئے ہیں۔ مانوگراف میں بہت ساری معلومات افزا باتیں درج ہو چکی ہیں، جن سے اقبال پسند یقیناً لطف اندوز ہونگے۔

۴ر مارچ ۲۰۰۰ء

ڈاکٹر بشیر احمد نحوی

ڈائرکٹر اقبال انسٹی ٹیوٹ

●●●

گذارشِ احوال واقعی

میں علامہ اقبال کو اپنے طالب علمی کے زمانے سے جانتا ہوں۔ یہ وہ زمانہ تھا جب لب پہ آتی تھی دعا بن کے تمنا میری۔ میری عمر کے ساتھ ساتھ علامہ اقبال کی شاعری اور شخصیت سے میری محبت اور عقیدت بھی بڑھتی رہی (بڑھ رہی ہے)۔ میں نے جب بھی اقبال کو پڑھا یا دِل میں یاد کیا' کسی شعر کے حوالے سے کسی واقعہ کے توسط سے' میرے ذہن کے نہاں خانوں کو ایک عجیب سی روشنی نے سیراب وشاداب کیا۔ میری آنکھوں میں ایک ایسے شخص کی تصویر ابھری جو اپنا سب کچھ دوسروں کے ذہنی فروغ کیلئے لٹا دینے پر تیار ہو۔ اقبال کی تصویر میں مجھے ہمیشہ ایک کشادہ ذہن' مخلص' صاحب ایثار' شکر گزار اور بامروت انسان کے خال وخد کے رنگ جھلکتے اور چھلکتے ہوئے نظر آئے۔ اقبال کی پوری زندگی مجھے ایک سبق کی طرح اور اُس کا کلام درس کی طرح لگتا ہے۔ میری لئے یہ راہ اور روشنی کا معاملہ اور ماجرا ہے۔

اس اجمالی تذکرے کے عنوانات پر لکھتے ہوئے مجھے محسوس ہوا کہ حیاتِ اقبال اور کلام اقبال کے کئی گوشوں پر ابھی کما حقہ' تحقیق وتبصرہ نہیں ہوا ہے۔ اس تذکرے کی ضخامت اس بارے میں کھل کر کہنے میں مانع رہی۔ میں نے کہیں واضح طور پر اور کہیں بین السطور کچھ اعتراضات اور مفروضات کا جواب فراہم کیا ہے اور کچھ سوالات کو سوال ہی رہنے دیا ہے تا کہ تحریک وتشویق کا باب کھلا رہے۔

یہ تذکرہ اِس خیال سے نہیں لکھا گیا ہے کہ اِس سے اقبالیات میں کسی لحاظ سے کوئی اضافہ ہوگا۔ یہ میرے عزیز محترم ڈاکٹر بشیر احمد نحوی صاحب'

ڈائریکٹر اقبال انسٹی ٹیوٹ کے حکم کی تعمیل کا ثبوت ہے۔ ایمانداری کی بات یہ
کہ جب انہوں نے اقبال پر ایک اجمالی تذکرہ لکھنے کی بات کی تو میں نے
بھری کیوں کہ اقبالؒ کی خدمت میں خراجِ عقیدت پیش کرنے کا یہ موقعہ میں ہا
سے جانے نہیں دینا چاہتا تھا۔ الحمدللہ میں اپنی بساط کے مطابق اس مرحلے
گزر گیا۔ میری حقیری کوشش کی پذیرائی ہو تو میں سمجھوں گا کہ یہ مشکور ہو گئی۔

حکیم منظور
یکم فروری ۲۰۰۰ء

●●●

شخصی اجمال

اٹھارویں صدی کے اواخر میں ایک نومسلم خاندان نے کشمیر سے ہجرت کر کے سیالکوٹ میں (جواب پاکستان کا حصہ ہے) سکونت اختیار کر لی۔ اس خاندان نے کشمیر سے ہجرت کیوں کی، اس کی تفصیل میسر نہیں ہوئی مگر کچھ تذکرہ نگاروں نے کشمیر میں سکھ راج کے ظلم وستم کو اس ہجرت کا سبب قرار دیا ہے۔ سکھوں کے دورِ حکومت میں کشمیریوں پر جو کچھ بیتی وہ تاریخ کا حصہ ہے۔ اِس لئے اِس وجہ سے مذکورہ خاندان کی ہجرت کو خارج از امکان قرار نہیں دیا جا سکتا۔ تاہم اس خاندان کے بعد کے زمانے تک کے معاشی حالات کے حوالے سے قیاس کیا جا سکتا ہے کہ بہتر مالی وسائل کا حصول بھی اِس ہجرت کا سبب اور مقصد رہا ہو گا۔

اس خاندان کے ساتھ 'شیخ' کا لاحقہ کشمیر کی روایات کے عین مطابق ہے۔ کشمیر میں اکثر نومسلم اپنے نام کے ساتھ 'شیخ' کا لاحقہ اس لئے جوڑتے تھے کہ معلوم ہو کہ وہ نومسلم ہیں اور کسی برہمن خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ اسی خاندان کے ساتھ ایک بزرگ شیخ محمد صالح تعلق رکھتے ہیں جن کی اولاد میں سے شیخ محمد رفیق وہ شخص تھے جنہوں نے کشمیر سے ہجرت کی۔ انہی شیخ رفیق صاحب کے فرزند شیخ نور محمد صاحب تھے جو ہمارے محمد اقبال کے والد گرامی تھے۔

شیخ نور محمد علوم ظاہری سے قطعاً نابلد تھے مگر فقیروں، درویشوں اور صوفیا کی صحبت میں اٹھنے بیٹھنے سے اُنہیں روحانیت کے ایسے سرچشموں تک رسائی حاصل ہوئی تھی جن سے فہم وادراک کی نہریں رواں رہتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ لوگ انہیں "اَن پڑھ فلسفی" کے نام سے بلاتے تھے۔ نور محمد صاحب رزق حلال اور استغناء کی

دولت سے مالا مال تھے۔ دنیوی دولت ان کی نظر میں بے وقعت اور ہیچ تھی۔ وہ فقر کی دولت سے مالا مال تھے اسی لئے 'فاقہ' کی نسبت کبھی حرف شکایت ہونٹوں پر نہیں لائے۔ ان کے فہم و ادراک اور دور بینی کا اس سے بڑا ثبوت کیا ہو سکتا ہے کہ وہ برقعوں کی ٹوپیاں سی سی کر اپنے اہل و عیال کی کفالت کا بوجھ بھی ڈھاتے تھے اور اپنے دو بیٹوں عطا محمد اور محمد اقبال کو جدید تعلیم سے آراستہ کرنیکا جتن بھی کرتے تھے۔ عطا محمد خیر سے انجینئر بن گئے اور محمد اقبال؟...... محمد اقبال "علامہ" "سر" شاعر مشرق کہلائے اور صفِ اوّل کے فلسفہ دانوں' مفکروں' اور سیاستدانوں میں شمار ہوئے۔

علامہ اقبال کی تاریخ و سنِ ولادت کا تعین بہت عرصے تک متنازعہ فی امر رہا۔ لالہ سری رام کے مطابق اقبال ۱۸۷۰ء میں پیدا ہوئے۔ خلیفہ عبدالحکیم اور پروفیسر عبدالقادر سروری نے ۱۸۷۲ء ان کا سنِ ولادت مقرر کیا۔ عبدالمجید سالک اور سید عابد علی عابد فروری ۱۸۷۳ء اور مالک رام اور نظیر صوفی نے دسمبر ۱۸۷۳ء ان کا سنِ ولادت بتایا۔ رام بابو سکسینہ نے ۱۸۷۵ء اور عبدالسلام ندوی نے ۱۸۷۶ء کو اقبال کا سنِ ولادت تسلیم کیا۔ حکومت پاکستان کی جسٹس کمیٹی نے فیصلہ دیا کہ ۲۹ دسمبر علامہ کی تاریخ اور ۱۸۷۳ء ان کا سنِ ولادت ہے۔ بہت تحقیق و تجسس اور بحث و مباحثہ کے بعد اب ۹ نومبر ۱۸۷۷ء کی تاریخ و سنِ ولادت پر اتفاق رائے ہو گیا ہے۔ اس اتفاق کی وجہ تحقیقی اور دستاویزی شہادتوں کے علاوہ یہ استدلال بھی ہے کہ اگر ۱۸۷۰ء کو اقبال کا سنِ ولادت مانا جائے تو پھر یہ بھی ماننا پڑے گا کہ انہوں نے میٹرک کا امتحان ۲۳ برس کی عمر میں پاس کیا۔ یہی مشکل دوسرے سنین کے حوالے سے بھی درپیش آتی ہے۔ اس حوالے سے کہ اقبال بے حد ذہین طالب علم تھے' جس کا سب سے بڑا ثبوت میر حسن جیسے نابغہ روزگار کا اقبال کی تربیت میں

دوسرے شاگردوں کے مقابلہ میں ان کی غیر معمولی دلچسپی بھی ہے اور اقبال کا میٹرک کے امتحان میں اول ہونا اور تمغہ اور وظیفہ حاصل کرنا بھی ہے۔ لہٰذا قرین انصاف یہی ہے کہ ۱۸۷۷ء کو ان کا سن ولادت مانا جائے تا کہ یہ تسلیم کرنے میں دقت نہ آئے کہ انہوں نے سولہ برس کی عمر میں میٹرک کا امتحان پاس کیا۔

اقبال نے اسکاچ مشن ہائی اسکول سیالکوٹ ہی سے ۱۸۹۵ء میں انٹرمیڈیٹ کا امتحان درجہ دوم میں پاس کیا۔ بی۔ اے گورنمنٹ کالج لاہور کے ذریعہ پنجاب یونیورسٹی سے درجۂ دوم میں پاس کیا تاہم عربی کے پرچے میں اول آنے پر خان بہادر ایف۔ ایس جلال الدین میڈل اور انگریزی کے پرچے میں اول آنے پر طلائی تمغہ حاصل کیا۔ ۱۸۹۹ء میں فلسفہ میں ایم۔ اے کا امتحان درجۂ سوم میں پاس کیا لیکن یونیورسٹی بھر میں فلسفہ کے مضمون میں واحد کامیاب امیدوار ہونے کی وجہ سے انہیں خان بہادر شیخ نانک بخش میڈل دیا گیا۔

لگتا ہے کہ میٹرک کے بعد نصابی تعلیم میں علامہ کی دلچسپی کم ہوگئی تھی۔ چونکہ وہ کتابی کیڑا قسم کے طالب علم نہیں تھے اور فطرتاً ذہین اور خلاق تھے اس لئے یہ ممکن دکھائی دیتا ہے کہ انہوں نے ۱۸۹۳ء کے بعد تخلیقی سرگرمیوں کی جانب زیادہ توجہ کی ہوگی۔ جس کا اثر درسی کتابوں کے مطالعہ پر پڑنا لازمی تھا۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ ان کی پہلی غزل دہلی سے شائع ہونے والے رسالہ "زبان" میں ۱۸۹۳ء میں شائع ہوئی۔ ایک اچھے شاعر کی حیثیت میں وہ اس زمانے میں کافی جانے پہچانے جاتے تھے جب وہ بی۔ اے کے طالب علم تھے۔ ایم۔ اے تک آتے آتے وہ کئی معرکتہ الآرا نظمیں اور غزلیں لکھ چکے تھے۔

ہیرا چاہے کسی حالت میں ہو ہیرا ہی رہتا ہے اور بیش قیمت ہوتا ہے۔ ہیرے کو ڈھنگ سے تراشنے اور پرکھنے والا ملے تو اس کی حیثیت اور قسمت میں کئی

گنا اضافہ ہونا لازمی ہے۔ اقبال بھی ایک ہیرا ہی تھے جسے پرکھنے اور تراشنے والوں میں اپنے زمانے کے نابغہ شامل تھے۔ ان کے مکتب کے استاد مولوی غلام حسین تھے۔ مکتب سے نکلے تو مولوی میر حسن کے سامنے زانوئے ادب تہہ کر جو ایک بار بیٹھے تو پوری عمر ذہنی طور پر زانوئے ادب تہہ کئے بیٹھے ہی رہے۔ میر حسن، فارسی، عربی، اُردو، اسلامیات، ادبیات، لسانیات، ریاضیات اور تفسیر کے لامثال عالم تھے۔ وہ روشن خیالی، وسیع المشربی اور کشادہ ذہنی کی چلتی پھرتی علامت تھے اسی لئے انہیں اقبال کا ''مجمع البحرین استاد'' کہا جاتا تھا۔ اسی مجمع البحرین استاد نے اقبال کو ایسا مجمع الکمالات، شاعر، فلسفی، مفکر اور مدبر بنایا کہ ان کو شہرت عام اور بقائے دوام کی دولت بیدار حاصل ہو گئی۔

اقبال کے دوسرے قابل ذکر اُستاد پروفیسر آرنلڈ تھے۔ آرنلڈ ایک مشہور دانشور تھے اور فلسفے کے استاد تھے جنہوں نے علی گڑھ کے بعد گورنمنٹ کالج لاہور میں ۱۹۰۴ء تک فلسفہ پڑھایا۔ انہی پروفیسر آرنلڈ نے اقبال کو فلسفے کے ایسے نہاں خانوں سے متعارف کیا جن کے دریچے مطالعہ اور مشاہدۂ کائنات کی وسعتوں میں کھلتے ہیں۔ آرنلڈ ہی نے اقبال کو سفر یورپ کی تحریک و تشویق دی تاکہ وہ مشرقی آئینے میں مغربی رنگوں کے عکس اور زاویوں سے ایسی قوسِ قزح تراش سکیں جو مشرق و مغرب، دونوں کیلئے دیدنی ہو۔ ایسا ہی ہوا اقبالؒ نے ایسا ہی کیا۔ اقبال کی شاعری، اُس کی نثری کاوشیں، اس کی زندگی کے آداب گرامی کے اس شعر کی صداقت پر گواہی دیتے ہیں ؎

در دیدۂ معنیٰ نگراں حضرت اقبال   پیغمبری کرد و پیمبر نتواں گفت

●●●

نجی کوائف

اقبال نے مشکل سے میٹرک پاس کیا تھا کہ اس زمانے کے شرفاء کی روایات کے مطابق ان کی شادی گجرات کے ایک سول سرجن، خان بہادر عطا محمد کی بیٹی کریم بی بی سے کی گئی۔ انہیں کے بطن سے اقبال کے پہلے بیٹے آفتاب احمد اور ایک بیٹی، مریم پیدا ہوئے۔ تذکرہ نگاروں نے لکھا ہے کہ اقبال اس شادی سے مطمئن نہیں تھے اسی لئے انہوں نے ایک کشمیری خاندان میں دوسرا نکاح کیا۔ اقبال کے نکتہ چیں اس بات پر سخت برہم ہیں کہ اقبال نے کریم بی بی کو طلاق کیوں دی اور بعد ازاں اپنی وصیت میں اسے اور آفتاب احمد کے نام کیوں جائداد میں سے ایک ہبہ تک مخصوص نہیں کیا۔ اس اعتراض کے جواب میں صرف اتنا کہا جا سکتا ہے کہ اولاً اقبال کی شاعرانہ شخصیت اور مفکرانہ مرتبے کے تعین میں یہ دو واقعات کوئی اہمیت نہیں رکھتے۔ ثانیاً اقبال نے کریم بی بی کو طلاق دے کر دنیا کو پہلی بار طلاق سے آشنا تو نہیں کیا نہ طلاق دینا کوئی غیر شرعی حرکت ہے کہ اس پر گرفت کی جا سکے۔ اس طلاق کی وجہ بداہتہً ذاتی اور شخصی رہی ہوگی۔ اگر کریم بی بی کا زیادہ پڑھا لکھا نہ ہونا کوئی وجہ ہوتی اور اقبال نے سوچا ہوتا کہ وہ ایسی بیوی کو لے کر کیسے سماجی تقاریب میں شرکت کر سکیں گے تو اس کی نفی اس واقعہ سے ہوتی ہے کہ وائسرائے لارڈ ولنگڈن نے جب جنوبی افریقہ میں اقبال کو ایک منصب کی پیشکش کی اور شرط یہ رکھی کہ وہ (اقبال) اپنی بیوی کا پردہ نہ کرائیں تو اقبال نے اِس آفر کو یہ کہہ کر رد کیا کہ اک معمولی عہدے کیلئے وہ شریعت محمدیؐ سے منہ نہیں موڑ سکتے۔ لہٰذا مزاجوں میں اختلاف، کریم بی بی کے میکے اور اقبال جیسے قناعت پسند

انسان کے معیارِ زندگی میں تفاوت، انہیں دو وجوہ سے طلاق کی ضرورت ناگزیر بن گئی ہوگی۔ ظاہر ہے کہ گھر میں روز روز کی کھٹ پٹ اور دانتا کل کل اقبال کو کسی تخلیقی سرگرمی کے قابل نہیں چھوڑتی۔ اس کے علاوہ انہیں اتنا سا سکون و اطمینان بھی حاصل نہیں ہوسکتا، جو ایک عام آدمی کو میسر ہوتا ہے۔ ذہنی آسودگی اور اطمینان و سکون، تخلیقی عمل کی بنیادی ضرورتیں ہیں۔ لہٰذا قرین قیاس لگتا ہے کہ مذکورہ دو میں سے ایک وجہ اس طلاق کی رہی ہوگی۔ اقبالؒ کریم بی بی سے کسی دوسری وجہ سے یا کریم بی بی میں کسی کمی کے سبب علیحدہ ہوئے ہوں، اس لئے صحیح نہیں معلوم ہوتا کہ آفتاب اور مریم کی ولادت کے بعد بھی کریم بی بی سے ان کا رشتہ قائم رہا۔ کسی خان بہادر کا داماد ہونے پر اقبال یقیناً ناخوش اور اس حیثیت سے دستبردار ہونے پر یقیناً خوش نہیں ہوئے ہوں گے۔ لہٰذا معترضین معروضی رویہ اختیار کریں گے تو ان کی اُلجھن دور ہوگی۔ اسی طرح آفتاب کو اپنی جائداد میں حصہ نہ دینے کیلئے آفتاب کی کچھ تذکرہ نویسوں کے مطابق نافرمانی اور والد سے علیحدگی ذمہ دار رہی ہوگی یا ممکن ہے کہ آفتاب نے والد سے کسی دوسری صورت میں اپنا حق حاصل کیا ہو۔ یہ صورت اِس لئے صحیح معلوم ہوتی ہے کہ آفتاب اقبال نے علامہ کی وصیت کے خلاف کوئی اقدام نہیں کیا جس کا مطلب ہے کہ ان کو علامہ سے کوئی شکایت نہیں تھی۔ لہٰذا معترضین کی مدعی سست گواہ چست، بننے کی ادا کوئی معنی مطلب نہیں رکھتی۔

اقبال نے دوسرا نکاح ایک کشمیری خاندان میں کیا۔ رخصتی سے پہلے حاسدوں نے غیبتوں اور چغلیوں کی آگ لگائی اور علامہ نے مجبوراً لدھیانہ کے ایک متمول خاندان میں شادی کی۔ لیکن کشمیری خاندان سے انہوں نے رجوع کر کے پھر رشتہ جوڑا جب پتہ چلا کہ ان کو غلط اطلاعات فراہم کی گئی تھیں۔ جاوید اقبال

اسی بیوی کے بطن سے پیدا ہوئے ہیں۔

اقبال عادتاً قناعت پسند تھے۔ اس میں کچھ تو خاندانی روایات اور تربیت کا عمل دخل تھا اور کچھ اسلامی تاریخ کی اولوالعزم شخصیات کے طرزِ حیات سے واقفیت اور اثر قبول کرنے کا نتیجہ تھا۔ طبیعت ان کی استغنائی تھی اسی لئے ضروریات سے زیادہ کی احتیاج کا کبھی اظہار نہیں کیا۔ اَکل حلال' کے لئے انہوں نے جتن کئے اور سب سے پہلے ۱۸۹۹ء میں اورینٹل کالج لاہور میں عربی کے ریڈر کے طور ملازمت اختیار کی۔ اس وقت ان کی عمر صرف بائیس (۲۲) برس تھی۔ ۱۹۰۱ء میں انہوں نے اسلامیہ کالج لاہور میں انگریزی کے استاد کے طور پر کام کیا۔ یہ عرصہ صرف چھ مہینے کا تھا۔ یہاں سے فارغ ہو کر وہ پھر اورینٹل کالج میں عربی پڑھانے لگے اور ۱۹۰۴ء تک وہیں رہے۔ ۱۹۰۵ء میں وہ یورپ کے سفر پر گئے اور واپسی پر گورنمنٹ کالج لاہور میں فلسفہ کے پروفیسر ہو گئے۔ انگلستان میں قیام کے دوران اقبال نے لندن یونیورسٹی میں چھ ماہ تک عربی کا درس دیا۔ انہوں نے گورنمنٹ کالج کو چھوڑ دیا تو وکالت کرنے لگے مگر خلافِ روایت اس پیشے میں انہوں نے اَکل حلال کی روش اپنائی جسکے سبب وہ پیسہ بٹورنے میں ناکام رہے۔ وہ مؤکل کو صاف صاف بتا دیتے تھے کہ اس کے کیس میں دَم نہیں اس لئے کسی بھی رقم کے عوض وہ اس کا کمزور مقدمہ نہیں لڑیں گے۔ علامہ چاہتے تو اپنی حیثیت اور شخصیت سے فائدہ اٹھا کر بہت ساری دولت کماتے مگر انہوں نے اپنے اخراجات کی حد زیادہ سے زیادہ آٹھ سو روپے مقرر کر رکھی تھی۔ آگے چل کہ اس حد کو گھٹا کر پانچ سو روپے ماہوار کر دیا اور جب بھوپال سے اسی رقم کا وظیفہ مقرر ہوا تو مطمئن ہو کر سر راس مسعود کو ۱۱ر ستمبر ۱۹۳۵ء کے خط میں منجملہ اور باتوں کے یہ بھی لکھا:

"اعلیٰ حضرت نواب صاحب بھوپال نے جو رقم میرے لئے

مقرر فرمائی ہے، وہ میرے لئے کافی ہے۔ اگر کافی نہ بھی ہو تو میں کوئی امیرانہ زندگی کا عادی نہیں۔ بہترین مسلمانوں نے سادہ اور درویشانہ زندگی بسر کی ہے۔ ضرورت سے زیادہ کی ہوس کرنا، روپیہ کا لالچ ہے جو کسی طرح بھی کسی مسلمان کے شایان شاں نہیں...... ان حالات پر نظر کرتے ہوئے مجھے مزید رقم قبول کرتے ہوئے حجاب آتا ہے"

اقبال کی آمدنی کے ذرائع مختصر سی قانونی پریکٹس، اعزازی لیکچروں، امتحانی پرچوں کی جانچ پڑتال اور تصانیف و تالیف تھے۔ کہا جاتا ہے کہ ۱۹۳۱ء میں جب ان کی صحت بگڑنے لگی تھی، انہیں اپنی تصانیف وغیرہ سے پچیس تیس ہزار روپے یکمشت حاصل ہوئے تھے جبھی "جاوید منزل" کی تعمیر ممکن ہو سکی جس کی ضرورت اس لئے محسوس ہوئی کہ علامہ کرائے کے مکانوں میں برسوں سے گزر بسر کرتے آئے تھے۔ خلیفہ عبدالحکیم کے مطابق:

"زراندوزی کی ہوس نہیں تھی۔ بس اپنے اخراجات کی حد تک ہی پریکٹس کرتے تھے۔ مجھ سے ایک مرتبہ فرمانے لگے کہ کوئی آٹھ سو روپے ماہوار تک وکالت کا کام لیتا ہوں" (رسالہ نقوش)

کچھ لوگوں کا یہ خیال کہ اقبال بحیثیت بیرسٹر کے ناکام تھے، جس کی وجہ ان کی نظر میں یہ تھی کہ علامہ دستور زمانہ کے خلاف ججوں کی چاپلوسی اور خوشامد کرنے پر رضامند نہیں تھے، اِس لحاظ سے غلط ہے کہ اولاً انہوں نے پریکٹس کی حد خود مقرر کی تھی اور ثانیاً اِس وجہ سے کہ علامہ کی حیثیت اُن کی وکالت کے زمانے میں مسلمہ تھی جس کے سبب اُنہیں کسی کی خوشامد کرنے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ بلکہ یہ بات قرین قیاس لگتی ہے کہ "سر محمد اقبال" کی خوشنودی حاصل کرنے اور ان سے مراسم بڑھانے کیلئے جج صاحبان از خود ایسی سہولیات ان کو فراہم کرتے کہ وہ

لاکھوں کماتے۔ اُن کی زندگی میں کسب مال کے اور بھی کئی مواقع پیدا ہوئے مگر اپنی استغنا پسندی اور خودداری کے سبب وہ اُن سے صرف نظر کرتے رہے۔ اس سلسلہ میں یہ واقعہ معترضین کے ذہن کے زاویے درست کرنے کیلئے شاید کافی ثابت ہو کہ جب سر اکبر حیدری، صدرِ اعظم حیدر آباد نے علامہ کو توشہ خانہ سے ایک ہزار روپے کا چیک بھیجا تو انہوں نے چیک اس قطعہ کے ساتھ واپس کر دیا۔

تھا یہ فرمانِ الٰہی شکوہ پرویز   دو قلندر کو کہ ہیں اس میں ملوکانہ صفات

مجھ سے فرمایا کہ لے اور شہنشاہی کر   حسن تدبیر سے دے آنی و فانی کو ثبات

غیرت فقر مگر کر نہ سکی اس کو قبول

جب کہا اس نے یہ ہے مری خدائی کی زکات

اس زمانے میں ایک ہزار روپے ایک خطیر رقم تصور ہوتی تھی پھر بھی علامہ نے یہ روپے لینے سے کیوں انکار کیا؟ اس لئے کہ ان کے کانوں میں بھنک پڑی تھی کہ یہ روپیہ اسی فنڈ سے ادا کیا گیا تھا جس سے نظام حیدر آباد مختلف حاجتمندوں کو مالی امداد سے نوازتے تھے۔ سر آغا خاں بھی علامہ کے لئے وظیفہ مقرر کرنے کا ارادہ رکھتے تھے اور اس سلسلہ میں نواب بھوپال اور سر راس مسعود سعی کر رہے تھے۔ کوئی شہادت نہیں ملتی کہ اقبال نے آغا خان کا وظیفہ منظور کیا بلکہ سر راس مسعود کو جو خط ۱۱ ستمبر ۱۹۳۵ء کو لکھا "مزید رقم قبول کرتے ہوئے حجاب آتا ہے" صاف طور پر آغا خاں وظیفہ قبول نہ کرنے کی طرف اشارہ فراہم کرتا ہے۔

بھوپال سے جو وظیفہ علامہ کو ملا وہ ان کی ذاتی کفالت کے علاوہ قرآن کریم پر اپنے افکار قلمبند کرنے کیلئے بھی تھا۔ اس بارے میں انہوں نے دو خط راس مسعود کو لکھے جن کے اقتباسات یوں ہیں:

"......میں قرآن کریم پر عہد حاضر کے افکار کی روشنی میں

اپنے وہ نوٹ تیار کر لیتا جو عرصہ سے میرے زیرِ غور ہیں۔ لیکن اب تو نہ معلوم کیوں ایسا محسوس کرتا ہوں کہ میرا یہ خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکے گا۔ اگر مجھے حیاتِ مستعار کی بقیہ گھڑیاں وقف کر دینے کا سامان میسر آوے تو میں سمجھتا ہوں کہ قرآنِ کریم کے اِن نوٹوں سے بہتر کوئی پیشکش مسلمانانِ عالم کو نہیں کر سکتا"

(۲۲/اپریل ۱۹۳۵ء)

"......... چراغِ سحر ہوں، بجھا چاہتا ہوں: تمنا ہے کہ مرنے سے پہلے قرآن کریم سے متعلق اپنے افکار قلمبند کر جاؤں...... تا کہ قیامت کے دن آپ کے جدِ امجد (حضور نبی کریمؐ) کی زیارت مجھے بھی اطمینانِ خاطر کے ساتھ میسر ہو کہ عظیم الشان دین کی، جو حضورؐ نے ہم تک پہنچایا، کوئی خدمت بجالا سکا"

اقبال کے دِل میں اسلامی فقہہ پر انگریزی زبان میں کچھ لکھنے کی تڑپ ۱۹۱۷ء میں پیدا ہوئی تھی۔ انہوں نے اِس ارادے سے سر کشن پرشادؔ وزیر اعظم حیدر آباد کو آگاہ کیا تھا مگر لگتا ہے کہ نظام حیدر آباد نے اس سلسلہ میں کوئی دلچسپی نہیں دکھائی۔ بھوپال کا وظیفہ جب مقرر ہوا علامہ کی صحت اُس وقت جواب دے چکی تھی لہٰذا علامہ کی دیرینہ خواہش پوری نہیں ہو سکی۔ بھوپال کا وظیفہ علامہ کو صرف دو سال اور نو مہینے تک ملا یعنی کل ملا کر ساڑھے سترہ ہزار (۱۷۵۰۰) روپے ملے۔

سر راس مسعود نے پانچ سو روپے کے وظیفے کی منظوری کے بارے میں علامہ کو جو خط لکھا اُس سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ اِس وظیفے کے پس پردہ نواب صاحب اپنی اسلام پسندی اور اقبال نوازی کی تشہیر چاہتے تھے۔ آج اگر نواب بھوپال کا نام اقبال کے ہر تذکرے میں لیا جاتا ہے تو اسی وظیفہ کے سبب سے جس

کی منظوری کے ساتھ سرراس مسعود کا یہ مشورہ بھی شامل تھا:

"......آپ کو ٹائٹل پیج پر یا اندر دیباچہ میں صاف اور واضح الفاظ میں اِس کتاب کا تعلق بھوپال کے موجودہ روشن دماغ فرماں روا سے دکھانا ضروری ہے کہ جنہوں نے ذاتی طور پر ممکن کر دیا کہ آپ اس کتاب کو لکھ سکیں میرا خیال ہے کہ اِس کتاب کو اُن کے نام سے معنون کر دیں اور عام رواج کے مطابق اِس میں یہ ظاہر کر دیں کہ اگر اُن کی مدد شامل حال نہ ہوتی تو یہ کتاب دِن کی روشنی نہ دیکھتی"

علامہ کے مزاج اور خودداری کو مدنظر رکھ کر شبہ وارد ہوتا ہے کہ ہو نہ ہو علامہ نے مجوزہ کتاب اس لئے نہ لکھی ہو کہ نواب صاحب کی جانب سے عائد کردہ شرائط حد درجہ نامناسب تھیں اور علامہ ان کو پورا کرتے تو اُن کی شخصیت پر داغ لگ جاتا جو کسی طرح بھی نہ دُھلتا۔

بہر حال نواب بھوپال کے وظیفہ کے علاوہ علامہ کے کسی اور سے مالی اعانت طلب کرنے یا قبول کرنے کی کوئی شہادت نہیں ملتی۔ تاہم علامہ کے مداح اور شیدائی ان کی خدمت میں تحفے' تحائف اور نذرانے پیش کرتے تھے' جن سے ان کے کام آسان ہوتے ہوں گے۔ اِن مداحوں میں رئیس بارہمولہ خواجہ عبد الصمد ککرو بھی شامل تھے۔ وہ قیمتی پشمینے کے دوشالے اُن کی نذر کیا کرتے تھے۔ بہر حال تمام ریکارڈ کھنگالنے سے یہی پتہ چلتا ہے کہ نچلے طبقے کے معیار زندگی سے کچھ اوپر اور درمیانہ طبقے کے معیار سے کچھ نیچے کی زندگی گزارنے پر علامہ قانع تھے۔ ان کا قد ستاروں سے اونچا تھا' ان کا ذہن آسمانوں کی طرح کشادہ تھا' صرف اُن کے ہاتھ لمبے نہیں تھے۔ اِس نابغۂ روزگار کی مالی حالت یہ تھی کہ جب راس مسعود نے اُنہیں لکھا کہ نواب صاحب وظیفہ میں اضافہ کی سوچ رہے ہیں تو اقبال

نے انہیں لکھا کہ نواب صاحب کچھ کرنا ہی چاہتے ہیں تو جاوید کی تعلیم کی تکمیل کے لئے جاوید کے نام وظیفہ مقرر کریں۔

علامہ اقبال کی زندگی تصنع اور دکھاوے سے عاری تھی۔ وہ انگریزی لباس پہنتے تھے مگر صرف عدالت یا کالج جانے کے وقت۔ وہ گھر لوٹتے تو اس عجلت سے سوٹ اتار دیتے تھے جیسے اس میں چیونٹیاں رینگتی ہوں۔ وہ گھر میں تہمد اور کرتہ پہنتے تھے اور ٹھیٹ پنجابیوں کے انداز میں چارپائی یا تخت پوش پر بیٹھ کر حقہ کے کش لگاتے تھے۔ تمام اکابر سے وہ اسی انداز میں ملتے اور ذرہ برابر بھی ہچکچاتے نہیں۔ حتیٰ کہ جب قائداعظم، محمد علی جناح بھی ان سے ملے وہ تہمد پہنے ہوئے، چارپائی پر تکیہ لگا کے بیٹھے تھے۔

جاوید سے علامہ کی محبت کی تشریح و تفسیر کی ضرورت نہیں۔ علامہ اپنے اس بیٹے کی ذہنی اور جسمانی تہذیب و تربیت کے بارے میں بے حد متفکر تھے۔ جاوید نے بھی باپ کی آرزوؤں کو پامال نہیں کیا بلکہ اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے چیف جسٹس کے عہدے تک کی منزلیں حیرت انگیز طور پر طے کیں۔ اپنے بہن بھائیوں اور والدین کے ساتھ علامہ کتنی محبت کرتے تھے اس کے ثبوت میں اپنے بھائی عطا محمد کی فوجداری کے ایک مقدمہ سے رہائی دلوانے کیلئے انہوں نے کیا کیا پاپڑ بیلے وہ ایک طویل قصہ ہے مگر التجائے مسافر میں انہیں ان الفاظ میں یاد کیا ہے:

وہ میرا یوسف ثانی وہ شمع محفلِ عشق
ہوئی ہے جس کی اخوت قرارِ جاں مجھ کو
جلا کے جس کی محبت نے دفترِ من و تو
ہوائے عیش میں پالا کیا جواں مجھ کو

ریاض دہر میں مانند گل رہے خنداں
کہ ہے عزیز تراز جان وجانِ جاں مجھ کو

اقبالؒ اپنی ماں سے کس قدر محبت اور عقیدت رکھتے تھے ''والدہ مرحومہ کی یاد میں'' کے عنوان سے ان کی نظم سے اس کا بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ اپنے جذبات کو علامہ نے جس شدّت اور سلاست کے ساتھ بیان کیا ہے وہ ان کے فن کی بلندی کے علاوہ، ماں کی جدائی کے صدمے سے ان کے دل کی حالت زار کا عکاس ہے:

کس کو اب ہوگا وطن میں آہ! میرا انتظار — کون میرا خط نہ آنے سے رہے گا بے قرار
خاک مرقد پر تری لے کر یہ فریاد آؤں گا — اب دعائے نیم شب میں کس کو میں یاد آؤنگا
عمر بھر تری محبت میری خدمت گر رہی — میں تری خدمت کے قابل جب ہوا تو چل بسی
مثلِ ایوانِ سحر مرقد فروزاں ہو ترا — نور سے معمور یہ خاکی شبستان ہو ترا

''میں تری خدمت کے قابل جب ہوا تو چل بسی'' میں اندوہ، افسوس اور آزار جاں کی کیا کیفیت ہے اس کا صرف احساس کیا جا سکتا ہے۔

✪✪✪

تخلیقی منظرنامہ ـــــ نثر

اقبال کی شاعری پر اتنا کچھ لکھا جا چکا ہے کہ اب اکثر مضامین باز گوئی کا معاملہ اور ماجرا دکھائی دیتے ہیں۔ اقبال کی نثر کی جانب بہت کم لوگوں نے توجہ کی ہے اور بہت کم لوگوں کو یہ علم اور اندازہ ہوگا کہ علامہ جتنے بڑے شاعر تھے اتنے ہی اہم نثر نگار تھے۔ شعری اظہار کیلئے انہوں نے فارسی اور اردو کو اعتبار بخشا اور نثر میں اپنے خیالات کی ترسیل کے لئے انہوں نے اُردو اور انگریزی زبان کو وسیلہ بنایا۔

یہ عجیب بات ہے کہ ہر چند شاعری کیلئے کچھ قواعد وضوابط مقرر کئے گئے ہیں جن کی پابندی سے کسی صورت میں مفر نہیں۔ نثر لکھنے میں ہر شخص آزاد ہے اور اپنی سی نثر لکھ سکتا ہے۔ شاعری کیلئے شعری زبان مخصوص ہے اور نظم وغزل میں ذرا سے تفاوت کے ساتھ ایک جیسی ہے۔ نثر کی زبان اصولاً مضمون کے اعتبار سے مختلف ہونی چاہئے تاکہ مضمون اور موضوع کا حق ادا ہو۔ صحافت کی زبان یقیناً شعری مجموعوں کی شرح کی زبان سے مختلف ہونی چاہئے۔ اقتصاد پر مضمون کی زبان وہ نہیں ہوسکتی جو زبان کسی مذہبی موضوع پر لکھتے ہوئے استعمال کرنے کی ضرورت ہے۔ تنقید کی زبان جغرافیائی مضامین کے بیان کا حق ادا نہیں کرسکتی بلکہ اجنبی سی معلوم ہوگی۔ تاریخ کی زبان کا علمی کے بجائے روزمرہ کی زبان ہونا اہم ہے تاکہ تاریخ عام وعوام تک پہنچے۔ ہمارے ہاں نثر میں کوئی تخصیص نہیں۔ ہر آدمی ہر قسم کی نثر لکھنے پر خود کو قادر سمجھتا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ اُردو میں اس سادہ نثر کا فروغ ہی نہیں ہوا ہے، جو شعر سے الگ آہنگ وادا کی حامل ہوتی۔ ہمارے اکثر نثر نگار صنعت تجنیس اور شاعرانہ آہنگ سے کام لیتے ہیں اور ایسی نثر لکھتے ہیں کہ بسا شعر

کا گماں گزرتا ہے۔

اس تناظر میں ہم جب اقبال کی نثر کو دیکھتے ہیں تو لگتا ہے کہ شاعری ہی کی طرح انہوں نے نثر لکھنے میں بھی اپنی الگ راہ نکالی اور ایک جداگانہ اسلوب اپنایا۔ ان کی پہلی باضابطہ نثری تصنیف ''علم الاقتصاد'' تھی۔ معاشیات کے بے حد الجھے ہوئے مضمون پر انہوں نے جس سلیقے اور سلجھے ہوئے انداز میں قلم اٹھایا ہے اسی سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ صاحب اسلوب نثر نگار تھے۔ علم الاقتصاد اُردو میں اپنی نوعیت کی پہلی کتاب تھی جس سے یہ واضح ہوا کہ اقبال جدید علوم پر گہری نظر رکھتے تھے اور یہ کہ اُردو واقعی علمی زبان ہے جو اقتصاد جیسے مضمون کے بیان کی متحمل ہو سکتی ہے۔ علم الاقتصاد میں اقبال نے جن مسائل کی نشاندہی کی ہے اور ان پر جو خیالات ظاہر کئے ہیں، ان کا تجزیہ الگ سے کرنے کی ضرورت ہے مگر اس کتاب میں جو زبان اقبال نے استعمال کی ہے وہ پڑھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ مثلاً ان کی نظر میں معاشی ضروریات کی تکمیل یا تشنگی کی وجوہات قومی، تمدنی، سماجی اور زرعی قوانین کے اسباب وعلل میں تلاش کرنا ازبس ضروری ہے اور یہ کہ مذہب کو اگر محض ایک اخلاقی اور روحانی ضابطہ قرار دیا جائے تو اس سے انسان کی سیرت و کردار کا مسئلہ تو حل ہو جائے گا مگر معاشی اور مادی ترقی کا مسئلہ لاینحل رہے گا۔ دیکھئے کس سادہ و پرکار الفاظ میں وہ اس نظریہ کی توضیح فرماتے ہیں :

''مذہب بھی تاریخ انسانی کے سیل رواں میں بے انتہا موثر ثابت ہوتا لیکن اکتساب رزق کا دھندا بھی ہر وقت انسان کے ساتھ لگا رہتا ہے۔ انسان کے ظاہری اور باطنی قویٰ کو چپکے چپکے اپنے سانچے میں ڈھالتا رہتا ہے۔ غریبی قوائے انسانی پر برا اثر ڈالتی ہے۔ بسا اوقات اس کی روح کے مجلی آئینے کو اس قدر زنگ آلود کر دیتی ہے کہ اخلاقی اور تمدنی لحاظ سے

اس کا وجود اور عدم وجود برابر ہو جاتا ہے"۔

مضامین کے علاوہ علامہ کی نثر کے دوسرے اہم ماخذ ان کے خطوط ہیں' جو انہوں نے وقتاً فوقتاً اپنے دوستوں اور مشاہیر وقت کو لکھے۔ ان خطوط میں علامہ نے جو زبان استعمال کی اور جس طرح انگریزی زبان کے الفاظ بے تکلفی سے استعمال کئے' اس سے انہوں نے اُردو نثر کو نئی سمتوں میں پیش رفت کا حوصلہ دیا۔ اس طرح انہوں نے اُردو زبان کو وسیع تر بنانے کی سعی مشکور بھی کی۔ اُردو زبان کو علمی' سائنسی' قانونی اور دوسرے موضوعات پر خیال آرائی کے قابل بنانے کے مقصد کے پیش نظر یہ ایک ضرورت تھی جس کا انہیں احساس وادراک تھا۔ نثر میں مختلف زبانوں کے بامعنی اور پر اثر الفاظ استعمال کرنے کا حوصلہ علامہ نے ہی فراہم کیا۔ ان کا اپنا ذاتی خیال تھا کہ "علمی زبان کو وزن دار اور رعب دار ہونا چاہئے' سبک اور شاعرانہ نثر علمی مسائل کے بیان میں کام نہیں آسکتی۔ علامہ کو چونکہ اکثر علمی' دینی اور سماجی موضوعات ہی پر اظہار رائے کرنا پڑتی تھی اس لئے ان کی نثر پُروقار اور بلند آہنگ ہے جو ان کے کسی پیشرو کی شناخت نہیں اور نہ ان کے اکثر ہمعصروں اور جانشینوں کی۔

انگریزی زبان کے الفاظ کا استعمال کر کے علامہ نے اُردو کی معرب اور مفرس نثر سے حسب ضرورت اجتناب کرنیکی طرف توجہ کرنے کا اشارہ فراہم کیا ورنہ انہوں نے جو الفاظ استعمال کیے ہیں انکے متبادل الفاظ اُردو میں موجود تھے۔

"میرا اعتراض حافظ پر بالکل اور نوعیت کا ہے۔ اسرارِ خودی میں جو کچھ کہا گیا ہے وہ ایک لٹریری[1] نصب العین کی تنقید تھی جو مسلمانوں میں کئی صدیوں سے پاپولر[2] ہے"

---

[1] علمی وادبی۔ [2] مقبول۔ مقبول عام

حافظ اسلم جیراجپوری کو ۷ ارمئی ۱۹۱۹ء کے خط میں لکھا۔

"خواجہ حافظ پر جو اشعار میں نے لکھے ہیں ان کا مقصد ایک لٹریری اصول کی تشریح اور توضیح تھا خواجہ کی پرائیویٹ[1] شخصیات یا ان کے معتقدات سے سروکار نہ تھا"۔

۱۱ ستمبر ۱۹۳۵ء کو سر مسعود کو ایک خط میں لکھا:

"...... آپ اس خط کو کانفیڈنشل[2] تصور فرمائیں۔ آپ کو یاد ہوگا میں نے آپ سے بھوپال میں آپ کے بڈروم[3] میں گفتگو کی تھی۔ میرا خیال تھا کہ میرا خیال معلوم کرنے کے بعد آپ نے شاید اس تجویز کو ڈراپ[4] کیا ہوگا۔

ان اقتباسات سے پتہ چلتا ہے کہ انگریزی الفاظ کا استعمال ایک شعوری عمل تھا جو کسی مجبوری کے تحت وقوع پذیر نہیں ہوا۔ یہی "شعوری کوشش" موجودہ اُردو نثر کی اساس بن گئی جو بذات خود نثر میں ایک بڑا کنٹریبوشن ہے۔ اقبالؔ بے تکلفی کے ساتھ قرارداد کے بجائے رزیولیشن، مجلس نوجوانان کے بجائے یوتھ لیگیں، حکومت کے بجائے گورنمنٹ پیشکش کے بجائے آفر، نہر کے بجائے کینال لکھتے تھے۔ ان کی نثری کاوشوں سے ایسے الفاظ کھنگالنے کا یہ موقع نہیں مگر "مشتے نمونہ از خروارے" سے ہی پتہ چلتا ہے کہ خرمن کا معیار اور مقدار کیا اور کتنا ہوگا۔

اقبال نے خطوط نویسی میں بھی مقصدیت کا عنصر شامل کر دیا۔ اُن کے

---

[1] نجی۔ انفرادی۔ ذاتی

[2] خفیہ/پوشیدہ

[3] خواب گاہ

[4] ترک

خطوط مختلف علمی و دینی امور کے بارے میں اُن کا نظریہ اور تاریخی پس منظر جاننے کا ایک بہترین ذریعہ ہیں۔ اقبال کے اکثر خطوط روز مرہ، معمولی اور معمولات حیات کے مسائل سے متعلق نہیں۔ اِن خطوط کا بیشتر حصہ علمی، ادبی، سیاسی، مذہبی معاملات کی گرہ کشائیوں کا ماجرا ہے۔ ہر چند کہ خطوط غالب اور خطوط اقبال کا موازنہ ہمارا نہ مقصود ہے نہ ایسا کرنا منطقی طور پر مناسب دکھائی دیتا ہے تاہم یہ بات کہنے سے باز نہیں رہا جاتا کہ غالب کے خطوط کا رنگ علمی یا دینی نہیں۔ غالب کے خطوط ایسے رند بے ریا کے خطوط ہیں جو زندگی اپنی اپج اور اپنے شرائط پر جینے کا خوگر ہے۔ جس کی نظر میں لاف دانش غلط ہے جسے نفع عبادت معلوم ہے اور جو دنیا و دین کو دُردِ تہِ ساغر غفلت سمجھتا ہے۔ اقبال کے یہاں زندگی، اپنی تمام تر سماجی اور مذہبی بندشوں اور پابندیوں کے ساتھ گزارنے کا معاملہ اور ماجرا تھی۔ اسی لئے ان کے خطوط کا رنگ، انداز، ادا، صدا اور زبان بالکل جداگانہ ہے۔ ان کی نثری زبان مضمون کے مطابق خود کو ڈھالتی ہوئی نظر آتی ہے اور علمی، سیاسی، مذہبی، اقتصادی، اخلاقی، تنقیدی، سائنسی، قانونی، تاریخی اور تمدنی مسائل کی گرہ کشائی کی صلاحیت کی آئینہ دار ہے۔ اسی لئے موجودہ نثر کا رنگ بہت حد تک ''اقبالی'' ہے۔ اُن کی مختلف النوع نثر کے دو نمونے:

''دراصل بقائے شخصی اور زندگی کے ارتقاء کے لئے تصادم ضروری ہے۔ میرے نزدیک بقا انسان کی بلند ترین آرزو ہے۔ اس لئے میں تصادم و پیکار کو ضروری سمجھتا ہوں۔ یہ انسان کو زیادہ مستحکم بناتی ہے''۔

(فلسفہ بقا کی اتنے سادہ الفاظ میں وضاحت اقبال ہی کا حصہ ہے)

''حیدر آباد دکن میں مختصر قیام کے دنوں میں میرے عنایت

فرما مسٹر نذر علی حیدری صاحب بی۔اے، معتمد محکمہ فائنانس، جن کی قابل قدر خدمات اور وسیع تجربے سے دولت آصفیہ مستفید ہو رہی ہے، مجھے ایک شب ان شاندار مگر حسرت ناک گنبدوں کی زیارت کیلئے لے گئے، جن میں سلاطین قطب شاہیہ سو رہے ہیں۔

رات کی خاموشی، ابر آلود آسمان اور بادلوں میں چھن کے آتی ہوئی چاندنی نے اس پر حسرت منظر کے ساتھ میرے دل پر ایسا اثر کیا جو کبھی فراموش نہ ہوگا۔

خالصتاً ایک غیر ادبی اور غیر علمی موضوع یعنی "نہر سویز" پر دیکھئے ا. مفکرانہ خیالات کا اظہار کس انداز سے کرتے ہیں:

"کسی شاعر کا قلم اور کسی سنگتراش کا ہنر اس شخص کے تخیل کی داد نہیں دے سکتا جس نے اقوام عالم میں اس تجارتی تغیر کی بنیاد رکھی...... یہ کینال، جسے ایک فرانسیسی انجینئر نے تعمیر کیا تھا، دنیا کے عجائبات میں سے ایک ہے۔ کینال کیا ہے، عرب اور افریقہ کی جدائی ہے اور مشرق و مغرب کا اتحاد۔ دنیا کی روحانی زندگی پر مہاتما بدھ نے بھی اس قدر اثر نہیں کیا جس قدر اس مغربی اختراع نے زمانہ حال کی تجارت پر کیا ہے (مکتوب بنام محمد دین فوق)

'حیات و ممات' کے فلسفہ پر مولانا غلام قادر گرامی کے نام ایک خط یوں روشنی ڈالی ہے کہ لگتا ہے کہ ان الفاظ کے بغیر، جو اس خط میں استعمال ہو ہیں، دوسرے الفاظ اس بیان کا حق ادا نہ کر پاتے۔ یہی اچھی نثر کی علامت ہے

"...... مسلم تو وہ خاک نہیں کہ خاک اسے جذب کر سکے۔ یہ ایک قوت نورانیہ ہے جو جامع ہے اور جواہر موسویت اور ابراہمیت کی

آگ اسے چھو جائے تو بردا سلاما بن جائے۔ پانی اس کی ہیبت سے خشک ہو جائے۔ آسمان وزمین میں یہ سمانہیں سکتی کہ یہ دونوں ہستیاں اس میں سمائی ہیں۔ پانی آگ کو جذب کر لیتا ہے۔ عدم بود کو کھا جاتا ہے۔ پستی بلندی میں سما جاتی ہے مگر جو قوت جامع اضداد ہو اور محلل تمام تناقضات کی ہو اسے کون جذب کرے۔ مسلم کو موت نہیں چھو سکتی کہ اس کی قوت، حیات وموت کو اپنے اندر جذب کر کے حیات وممات کا تناقض مٹا چکی ہے"۔

(انسان آب و آتش، خاک وباد کے ضمیر سے تیار ہوا ہے۔ اس تناظر میں مندرجہ بالا جملوں میں خط کشیدہ الفاظ اپنے اندر ایک جہان معنی لئے ہوئے ہیں)

ایک اور خط میں مولوی ظفر احمد صاحب صدیقی کو عقائد اسلامی کے بارے میں اس خاص انداز سے اپنی رائے سے آگاہ کرتے ہیں:

"......دین اسلام جو ہر مسلمان کے عقیدے کی رو سے ہر شئی پر مقدم ہے، نفس انسانی اور اس کی مرکزی قوتوں کو فنا نہیں کرتا بلکہ ان کے عمل کیلئے حدود متعین کرتا ہے۔ ان حدود کے متعین کرنے کا نام اصطلاح اسلام میں شریعت یا قانونِ الٰہی ہے"۔

اُردو زبان کو ایک 'تازہ دم' وسیع تر معنوں میں تخلیقی سطح پر ایک نئے نثری لب ولہجہ اور آہنگ سے آشنا کرنے والے اِس نابغہ کی کسرنفسی کا عالم دیکھئے کہ لکھتے ہیں:

"آپ مطمئن رہیں، مجھے اساتذہ کی ہمسری کا دعویٰ نہیں۔ اگر اہل پنجاب مجھے بہ ہمہ وجوہ کامل خیال کرتے ہیں تو ان کی غلطی ہے۔ زبان کا مسئلہ بڑا نازک ہوتا ہے۔ یہ ایک ایسی دشوار گزار وادی ہے،

بالخصوص ان لوگوں کو جو اہل زبان نہیں ہیں' یہاں قدم قدم پر ٹھوکر لگنے کا اندیشہ ہے"۔

اس دشوار گزار وادی میں قوس قزح بکھیرتے ہوئے' ایک دقیق مسئلے پر خیال آرائی کے مشکل مرحلے سے اقبال کیسے گزرتے ہیں' ملاحظہ فرمایئے:

"......اس اعتبار سے مسلمانوں کو دیکھا جائے تو ان کی حالت نہایت مخدوش نظر آتی ہے۔ یہ بد قسمت قوم حکومت کھو بیٹھی ہے۔ صنعت کھو بیٹھی ہے۔ تجارت کھو بیٹھی ہے۔ اب وقت کے تقاضوں سے غافل اور افلاس کی تیز تلوار سے مجروح ہو کر ایک بے معنی توکل کا عصا ٹیکے کھڑی ہے۔ اور باتیں تو خیر' ابھی تک ان کے مذہبی نزاعوں کا ہی فیصلہ نہیں ہوا۔ آئے دن ایک نیا فرقہ پیدا ہوتا ہے' جو اپنے آپ کو جنت کا وارث سمجھ کر باقی تمام نوع انسان کو جہنم کا ایندھن قرار دیتا ہے۔ غرضیکہ ان فرقہ آرائیوں نے خیر الامم کی جمعیت کو کچھ ایسی بری طرح منتشر کر دیا ہے کہ اتحاد و یگانگت کی کوئی صورت نظر نہیں آتی"۔ (اقتباس از مضمون قومی زندگی)

"مولوی صاحبان کی یہ حالت ہے کہ اگر کسی شہر میں اتفاق سے وہ جمع ہو جائیں تو حیات مسیح یا آیات ناسخ و منسوخ پر بحث کرنے کیلئے ......اور بحث چھڑ جائے (اور بالعموم بحث چھڑ جاتی ہے) تو ایسی جوتیوں میں دال بٹتی ہے کہ خدا کی پناہ" (ایضاً)

اقبال کے خطوط اور مضامین سے پیش کردہ اقتباسات مختلف موضوعات سے متعلق اور منسلک ہیں۔ ذرا سا غور کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ ہر موضوع نے ان کے قلم سے ایک مخصوص اور دوسروں سے مختلف محاورہ اور اسلوب ڈھلوایا ہے۔ ان

کی نثر سپاٹ نثر نہیں نہ وہ تجنیسی اور مصنوعی نثر ہے، جو دوسرے لوگ لکھتے آئے تھے، لکھ رہے تھے یا آج لکھ رہے ہیں۔ ان کی نثر اصلی نثر ہے اور اصلی نثر کا اعلیٰ نمونہ۔

ضرورت اِس بات کی ہے کہ اقبال کی نثر (بالخصوص اُردو نثر) پر کچھ کام کیا جائے اور اس اسلوب کو فروغ دیا جائے جسے انہوں نے پیدا کیا یعنی زبان کی سطح پر اُردو کو ایسے تغیرات سے آشنا کیا جائے جو اس سائنسی اور ٹیکنالوجی کے اندھے سفر اور تیز رفتار دور کا ساتھ دے سکے۔ تحفظات اور 'ریشم کے کیڑے' کے انداز حیات سے گریز اس سمت میں کار آمد ثابت ہو سکتا ہے۔ بس علامہ کی طرح ایک حوصلہ سے کام لینے کی ضرورت ہے۔

✪✪✪

تخلیقی منظر نامہ ــــ شاعری (غزل)

اقبال کے اکثر تذکرہ نگاروں کے مطابق اقبال نے اس زمانے میں شعر لکھنا شروع کیا تھا' جب وہ سکول میں پڑھتے تھے۔ ان کے سکول کا زمانہ یوں تو ۱۸۸۳ء سے ۱۸۹۳ء تک رہا (یعنی جب انہوں نے میٹرک کا امتحان پاس کیا) لیکن شعر انہوں نے ۱۸۸۵ء ہی میں کہنے شروع کیے تھے۔ اسی سن میں انہوں نے سیالکوٹ میں منعقدہ ایک مشاعرے میں شرکت کی۔ اس پر شک کرنے کی گنجائش اس لئے نہیں کہ جو شاعر تلمیذ رحمان ہوتے ہیں' ان میں شعر گوئی کی صفت فطرتاً ودیعت ہوتی ہے اور ثانیاً اس لئے کہ ۱۸۹۳ء میں اقبال کی شعر گوئی کا یہ رنگ تھا کہ دہلی سے چھپنے والے ایک رسالہ "زبان" میں ان کی غزل شائع ہوئی ۱۸۹۳ء میں اقبال صرف سولہ برس کے تھے۔ اگر یہ فرض کیا جائے کہ ۱۸۹۳ء ہی میں یعنی جب اقبال سولہ برس کے تھے انہوں نے پہلی غزل کہی اور اس پایہ کی کہی کہ دہلی کے ایک رسالہ میں چھپی' جب بھی یہ ان کے فطری شاعر ہونے کی دلیل ہے۔ ایک سو سال سے زیادہ عرصہ گزرنے کے بعد بھی' آج کے بچے' جنہیں ہر طرح کی سہولیات میسر ہیں اور جن کے حصے میں ایک ترقی یافتہ دور آیا ہے' اپنے دُنیا و مافیہا ہی سے آشنا نہیں چہ جائیکہ وہ شعر کہنے کی سوچیں اور پھر ایسے اشعار کہہ سکیں:

ے بر سر زینت جو شمع محفل جانانہ ہے
شاید اس کی زلف پیچاں کا پر پروانہ ہے
پائے ساقی پر گرایا جب گرایا ہے مجھے
چال ہے خالی کہاں یہ لغزش مستانہ ہے

ایک روایت یہ بھی ہے کہ ۱۸۸۶ء میں ابو سعید شعیب کے رسالہ ''مختصر العروض'' کیلئے اقبال نے قطعہ تاریخ کہا جس کا ایک شعر یہ ہے:

؎ مصنف جب کہ ایسا ہو' رسالہ کیوں نہ ہو ایسا
گہر باری تقاضا ہے' مزاج ابر نیساں کا

اِن روایات کے صحیح ہونے پر بلاوجہ شک بھی کیا جائے جب بھی اقبالؔ نے پروفیسر سید عبدالرشید فاضلؔ کے مطابق:

؎ موتی سمجھ کے شان کریمی نے چن لئے
قطرے جو تھے مرے عرق انفعال کے

بیس سال کی عمر میں کہا۔ اسی شعر کو سن کر حضرت ارشد گورگانی نے بیتابانہ کہا تھا ''اقبال! یہ عمر اور ایسا شعر''۔

متذکرہ قطعہ تاریخ کو مختصر العروض میں اس تمہید کے ساتھ شائع کیا گیا:

''شاعر با کمال' ناظم عالی خیال' جناب منشی محمد اقبال صاحب اقبال شاگرد جناب داغ دہلوی' متعلم بی۔اے۔ کلاس گورنمنٹ کالج لاہور''

دانائے راز (مصنف سید نذیر نیازی) میں لکھا ہے کہ یہ قطعہ ۱۸۸۶ء میں اقبال نے کہا۔ ۱۸۸۶ء بداہتہً سہو کتابت کا نتیجہ ہے اور کیوں کہ اقبال بی۔اے کے طالب علم تو ۱۸۹۸ء میں تھے اس لئے ۱۸۹۸ء درست سمجھا جانا چاہئے۔ یہ ہے 'ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات' کی ایک جھلک۔

جیسا کہ ابتدا میں عرض کیا جا چکا ہے' اقبال کی شاعری اور اس کے شعری سفر پر اتنا کچھ لکھا جا چکا ہے کہ اس میں کسی اضافے کی گنجائش مشکل دکھائی دیتی ہے۔ اقبال کی شاعری کی صداقتیں اور سچائیاں تبدیل نہیں ہوئی ہیں (نہ ہو سکتی ہیں) نہ اُنکے بارے میں اس سے زیادہ کچھ لکھا جا سکتا ہے جو اعلیٰ پایہ کے ناقد' علماء

اور مفکر لکھ چکے ہیں۔ اِن سچائیوں اور صداقتوں میں تاہم زمانے کی ترقی کے ساتھ ساتھ مزید معنی تلاش کرنے کی ضرورت موجود ہے (رہے گی) یہ عمل ممکن ہے اضافہ کے ضمن میں نہ آئے مگر توسیع (extension) کے پہلو اجاگر کرسکتا ہے۔ مثلاً اقبال کے کلام میں کئی ایسے اشعار ہیں جو انکے اس دعویٰ کو ثابت کرتے ہیں کہ ؎

حادثہ جو کہ ابھی پردۂ افلاک میں ہے
عکس اس کا میرے آئینہ ادراک میں ہے

ان اشعار کو کھوجنا اور ایک تناظر میں رکھ کر انہیں سمجھنا اقبال کی فکر کے نئے گوشے وا کرسکتا ہے۔ اس مختصر سے تذکرے میں اس موضوع پر بات کرنا ممکن نہیں مگر توسیع معانی کے ضمن میں یہ اشارہ کرنا ناگزیر بن گیا۔

اقبال کی شاعری کے حوالے سے ذاتی طور پر راقم الحروف ہمیشہ اس الجھن کا شکار رہا ہے کہ اقبال اصلاً غزل کے شاعر تھے یا نظم کے۔ جب ان کی غزل پڑھیں تو خیالات کا تسلسل جو ایک مخصوص منظر نامہ ترتیب دیتا ہے اور کبھی اقبال غزل کے آخر پر فارسی کا یا ایک دوسرے ہی ردیف قوافی میں ایک شعر کا اضافہ کرتے ہیں تو لگتا ہے کہ یہ نظم ہے اور نظم کے لوازمات کو پورا کرتی ہے۔ اس سلسلہ میں ملازادہ ضیغم لولابی کشمیر کی بیاض کی پہلی غزل توجہ طلب ہے۔ اچھی نظم کی پہچان یہی ہے کہ اگر اس سے ایک مصرعہ خارج کیا جائے تو نظم کے معانی بدلنے چاہئیں یا اس کے تاثر کی شدت میں کمی کا احساس ہونا چاہیے۔ یہ واردات اقبال کی اکثر غزلوں پر وارد ہو جاتی ہے۔ اقبال کی نظم کے کئی اشعار کی شائستگی، تحملیت اور معنویت کو محسوس کر کے لگتا ہے کہ یہ غزل کے اشعار ہیں۔ بہر حال اقبال کی غزل کا وصف یہ ہے کہ یہ ''بازناں گفتن'' کی حکایت یا معاملہ اور ماجرا نہیں۔ اقبال کی غزل عمومی اور عام قسم کے عشق و محبت کی غزل نہیں، اس عشق کی رازدار غزل ہے

جس کی آبادیاں صحرایا کہساروں میں نہیں، فضائے بسیط کے علاوہ خود عاشق کے دل میں آباد ہیں۔ یہ عشق وہ عشق نہیں جس کی علامت مجنون وکوہکن ٹھہرے۔ یہ عشق خودشناسی سے خداشناسی کی منزل تک محیط ہے۔ یہ "غزل با مرداں گفتن" کی واردات ہے۔ اسی لئے وثوق سے کہا جاسکتا ہے کہ آج غزل کا جو مردانہ لب و لہجہ ہے وہ اقبال کی دین ہے:

؎ تیری نفس سے ہوئی آتش گل تیز تر	مرغ چمن ہے یہی تیری نوا کا صلہ
؎ رہا نہ حلقہ صوفی میں سوز مشتاقی	فسانہ ہائے کرامات رہ گئے باقی
؎ میری نوائے شوق سے شور حریم ذات میں	غلغلہ ہائے الاماں بتکدہ صفات میں
؎ احوال محبت میں کچھ فرق نہیں ایسا	سوز وتب وتاب اول، سوز وتب وتاب آخر
؎ عزیز تر ہے متاع امیر و سلطان سے	وہ شعر جس میں ہو بجلی کا سوز و براقی

یہ اشعار اس نئی غزل کا جزنامہ ہیں، جو اقبال کا فن بنی۔ اس غزل کا لب ولہجہ، آہنگ، مضامین اس زمانے میں اجنبی کے معنوں میں اجنبی تھے۔ یہ غزل نہ اساتذہ کی غزل کی ہم نشیں تھی نہ غالبؔ کی غزل کی پیرو تاہم غالبؔ کی غزل کی توسیع ضرور تھی۔ جدید اُردو شاعری نے الفاظ ومعانی اور مضامین کی سطح پر جو جدت اپنائی اس کا حوصلہ اسے اقبال کی شاعری نے بالعموم اور بالخصوص اقبال کی غزل نے عطا کیا۔

اقبال نے کل ۱۲۹ غزلیں کہی ہیں:

بانگ درا...... حصہ اول = ۱۴ (مردّف)

حصہ دوم = ۷ (مردّف)

حصہ سوم = ۷ (مردف)

کل = ۲۸

بال جبریل = ۶۱+۱۶ = ۷۷ ، ضرب کلیم = ۵ ، ارمغان حجاز = ۱۹

جن میں سے معتد بہ تعداد غیر مردّف غزلوں کی ہے۔ اقبال کے زمانے میں یا اس سے پہلے غیر مردّف غزلیں کہنے کا رواج ہی نہیں تھا بلکہ شعراء مصرعے اٹھواتے تھے اور 'قافیہ بول رہا ہے' کا نعرہ مستانہ بلند کرتے تھے۔ اقبال نے غیر مردّف غزلوں کو اعتبار بخش کر گویا رسم عام کے خلاف روش اختیار کی اور جدت طبع کا اظہار کیا۔ غزل میں اقبال کا یہ اجتہاد غزل کی نئی وضع بن گیا۔

اقبال کی غزلوں (اور نظموں) کا ایک وصف یہ بھی ہے کہ ان کے خیالات کی لہر زیریں ان کے 'نوجوانوں' سے مختص ہونے کا پتہ دیتی ہے۔ یوں تو کوئی بھی شاعری کسی مخصوص طبقے سے مخصوص نہیں ہوتی۔ مگر اقبال کی شاعری عام طور سے نوجوانوں سے تخاطب کا معاملہ اور ماجرا لگتی ہے۔

مہ و ستارہ ہیں بحر وجود میں گرداب　　دل و نظر کا سفینہ سنبھال کر لے جا
نہ ہو تو مرد مسلماں بھی کافر و زندیق　　اگر ہو عشق تو ہے کفر بھی مسلمانی
پھر اس میں عجب کیا کہ تو بیباک نہیں ہے　　دل سوز سے خالی ہے نگہ پاک نہیں ہے

ان اشعار کا آہنگ' لہجہ' پیغام بداہتہً نوجوانوں سے ہے۔ جب ''پیغام'' کی بات درمیاں میں آجائے تو غزل کے حوالے سے یہ شکوک دل میں ابھرتے ہیں کہ فن شعر سے یقیناً اغماض برتا گیا ہوگا۔ اقبال کی غزل کا یہی وصف ہے کہ خطیبانہ اور پیامی ہونے کے باوصف وہ غزل کی روایات سے جڑی ہوئی ہے۔ چونکہ یہ ممکن نہیں کہ پوری غزلیں quote کی جائیں لہٰذا زیر نظر تین اشعار پر توجہ کرتے ہیں۔ ان اشعار میں لفظیات کی دروبست' شعریت اور سوز کے لحاظ سے کوئی کمی نہیں ہاں یہ شعر یا اقبال کے دوسرے شعر محض عروض کی پیروی اور پابندی کی داستان نہیں۔ اس بارے میں خود ان کا اپنا خیال تھا:

''میں فقط فرسودہ مضامین' کی حد تک جدید و قدیم کی بحث کو

مانتا ہوں۔ شاعری کی جان تو شاعر کے جذبات ہیں۔ جذبات انسانی اور کیفیاتِ قلبی، اللہ کی دین ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ طبع موزوں اس کے ادا کرنے کیلئے پُر اثر الفاظ کی تلاش کرے۔ نظم کے اصناف کی تقسیم جو قدیم ہے ہمیشہ رہے گی اور انسانی جذبات ماحول کے تابع رہیں گے۔ بس یہ سمجھ لیا جائے کہ جس شاعر کے جذبات ماحول سے اثر پذیر ہیں، وہ شاعر جدید رنگ کا حامل تصور ہو سکتا ہے۔ اگر ہم نے پابندئ عروض کی خلاف ورزی کی تو شاعری کا قلعہ ہی منہدم ہو جائے گا"

اقبال کی غزلوں کی لفظیات غزل کیلئے نامانوس تھی۔ یہ لفظیات اوروں کی تو بات نہیں غالب کی بھی نہیں تھی۔ غالب اور اقبال کی غزلوں میں ایک ہی قدر مشترک یہ ہے کہ دونوں کا اسلوب تکلف سے تہی ہے اور ان کی اپنی فکر کا تراشا ہوا ہے۔ غالب کو انسانی نفسیات کے سمندر کا غوطہ خور کہا جائے تو غلط نہیں اور انسانی نفسیات کو اشاروں کنایوں میں غالب کے انداز و ادا میں بیان کرنا صرف غالب کا حق اور حصہ تھا۔ اسی طرح اقبال کے سامنے پورا فلسفہ حیات ایک آغوش آسماں کی طرح وا تھا اور اس فلسفے کے ٹانڈے مذہب، تاریخ، تمدن، تہذیب، علم، حکمت اور سب سے بڑھ کر انسان، کائنات اور خالق کائنات کے تکون کے پر پیچ زاویوں سے ملتے تھے۔ انہی زاویوں میں انسان کا درجہ متعین کرنے کی داستان اقبال کی شاعری ہے۔ وہ اس "حرف راز" سے واقف تھے، اسی لئے کہا۔

وہ حرفِ راز کہ مجھ کو سکھا گیا ہے جنوں
خدا مجھے نفس جبرئیل دے تو کہوں

الفاظ شماری کا یہ موقعہ نہیں ورنہ اقبال کی غزلوں سے سینکڑوں ایسے الفاظ اور تراکیب پیش کی جا سکتی ہیں، جن کا خود ان کے دور میں بھی کہیں اتا پتا نہیں ملتا،

قدماء کی تو بات ہی نہیں۔ اسی شعر میں دیکھا جا سکتا ہے کہ 'حرف راز' اور 'نفس جبرئیل' دو ایسی تراکیب ہیں جو بالکل نئی اور مختلف الجہت معانی کی حامل ہیں۔ اسی طرح ''جنوں'' کے لفظ کی معنوی وسعتوں پر غور کریں تو پتہ چلے گا کہ یہ وہ جنوں نہیں جو مجنوں کو لیلیٰ سے تھا۔ یہ ''جنوں'' خود آگاہی اور خدا آگاہی کی منزلوں کا رہنما اور راہبر ہے۔

اقبال کی غزل' جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے' جدید غزل کے لئے پیش رفت کا اشارہ تھی مگر افسوس جدید غزل کھردرے پن' فنی سطح پر take it easy کے رجحانات کی شکار ہوئی۔ مضامین کی سطح پر اگر اقبال سے پہلے کی غزل عام طور سے صوفیانہ وارداتوں' عشق و عاشقی اور لب و رخسار کا افسانہ تھی تو اقبال سے بعد کی جدید غزل یاسیت' خوف' موت' مشینی اور صنعتی انقلاب سے پیدا شدہ اضطراب کی داستان ہوئی۔ جدید غزل کو زندگی کے سامنے خود سپردگی کی تحریک یا پھر غیر حقیقی اور تصوراتی بلکہ 'قول محال' کی اسیر غزل کہا جا سکتا ہے۔ اس کے برعکس اقبال کی غزل' اس کرۂ ارض پر رہتے بستے' چلتے پھرتے اور سانس لیتے ہوئے انسان کے فکر اور حرکی قوت کا بولتا ہوا ماجرا اور معاملہ ہے:

ے دریا میں موتی' اے موج بیباک
ساحل کی سوغات' خار و خس و خاک
ایسا جنوں بھی دیکھا ہے میں نے
جس نے سیئے ہیں تقدیر کے چاک

ے کیا ہے تجھ کو کتابوں نے کور ذوق اتنا
صبا سے بھی نہ ملا تجھ کو بوئے گل کا سراغ

صحبت پیر روم سے مجھ پہ ہوا یہ راز فاش
لاکھ حکیم سر بجیب ' ایک کلیم سر بکف

ان اشعار میں جن خیالات کا اظہار ہوا' ان کی بلندی اور جن الفاظ میں یہ اشعار کہے گئے ہیں اُن کے معانی کا فراز' یہی ثابت کرتا ہے کہ اقبال کی 'غزل' اقبال کی غزل تھی۔

غالب نے غزل کی تنگنائی کو بقدر ذوق نہیں پایا تھا مگر اُس کے باوجود فارسی اور اُردو' دونوں زبانوں میں' اُس کے جوہر غزل ہی میں کھلے۔ اقبال نے ہر چند کہ غزل کو اپنے اظہار کیلئے تنگ نہیں پایا اور نظم پر زیادہ توجہ کی مگر عجب اتفاق ہے کہ اقبال سے بھی عقیدت کا نقطۂ آغاز عام طور سے غزل ہی ہے۔

اقبال کی غزل کا ایک اور وصف' طبع زاد' خوبصورت اور شگفتہ مزاج تراکیب ہیں۔ تراکیب کے استعمال کی مثالیں اُردو غزل میں شاذ ہی ملتی ہیں بلکہ یوں کہنا مبالغہ ہوگا کہ تراکیب کے استعمال سے اُردو شاعری ناواقف تھی۔ اقبال نے تراکیب سازی کو فن کا درجہ دیا جس نے جدید شاعروں کو فن کی اس سمت میں قدم رکھنے کا حوصلہ دے دیا۔ ہر غزل میں ایک یا ایک سے زیادہ ایسی ترکیبیں سامنے آتی ہیں کہ قاری ان کی تازگی اور شعری حسن کے سحر میں کھو جاتا ہے۔ گمان غالب ہے کہ پڑھے لکھوں کی تو بات الگ شعر و سخن کے ایک عام قاری کو اقبال کے جتنے اشعار ازبر ہوں گے' دوسرے کسی شاعر کے نہیں ہوں گے چاہے وہ استادِ سخن میر ہوں یا استادِ ریختہ غالب۔

اقبال کی غزل میں ایک مبسوط علامتی نظام بھی موجود ہے جو ان کی غزل کا ایک اور خاصا ہے۔ ہر چند کہ علامتوں سے متعلق ملارمے کی تحریک ۱۸۷۷ء میں یعنی جب اقبال پیدا ہوئے' ختم ہو چکی تھی تاہم اقبال کو چھوڑ کر ۱۹۵۷ء تک

علامتی اظہار پر کسی نے توجہ نہیں کی۔ جدید شاعروں نے البتہ علامتی اسلوب کو فروغ دینے کی سعی مشکور کی۔ تاہم یہ اعتراف کرنا ہی پڑے گا کہ اس راہ کو بھی علامہ نے ہی روشن کیا اور اعتبار بخشا۔

یہ بات شاید پہلے کہنے کی تھی کہ اقبال کی اُردو شاعری کا پہلا مجموعہ "بانگ درا" ۱۹۲۴ء میں اشاعت پذیر ہوا۔ اس کے پہلے حصے میں ان کا ۱۹۰۵ء تک کا کہا ہوا کلام دوسرے حصے میں ۱۹۰۵ء سے ۱۹۰۸ء تک کا اور تیسرے حصے میں ظاہر ہے کہ سال ۱۹۰۸ء سے ۱۹۲۴ء تک کا کلام شامل ہے۔ ۱۹۰۵ء میں اقبال یورپ کے سفر پر گئے۔ وہ ۱۹۰۸ء میں وطن لوٹے۔ حیرت ہوتی ہے کہ اقبال نے ان تین برسوں میں صرف چوبیس چھوٹی بڑی نظمیں لکھیں۔ اگر یہ تسلیم کیا جائے کہ اقبال نے ۱۸۸۵ء سے شعر کہنا شروع کیا تو ۱۹۰۵ء تک انہوں نے صرف انچاس (۴۹) نظمیں اور تیرہ (۱۳) غزلیں کہی تھیں۔ اسی طرح ۱۹۰۸ء سے ۱۹۲۴ء تک یعنی سولہ برس میں انہوں نے ستر (۷۰) نظمیں اور سات (۷) غزلیں اور کچھ ظریفانہ اشعار کہے جو محض تفنن طبع اور صحبت اکبر (الہ آبادی) کا نتیجہ ہیں۔

اقبال کا دوسرا مجموعہ 'بال جبریل' ۱۹۳۵ء میں چھپا۔ بال جبریل میں ظاہر ہے کہ ۱۹۲۵ء سے ۱۹۳۵ء تک کا کلام شامل ہے۔ ان گیارہ برسوں میں اقبال نے صرف ۷۷ غزلیں، انتالیس (۳۹) رباعیات (رباعی کے معلوم اوزان میں سے یہ کسی ایک وزن پر پورا نہیں اترتیں) اور چھوٹی بڑی پچپن (۵۵) نظموں (جن میں شہرہ آفاق نظم مسجد قطبہ اور ساقی نامہ شامل ہیں) کہی ہیں۔ 'ضرب کلیم' کے نام سے ایک اور شعری مجموعہ ۱۹۳۶ء میں چھپا جس سے پتہ چلتا ہے کہ صرف ایک سال میں اقبال نے ایک سو اٹھہتر (۱۷۸) چھوٹی بڑی نظمیں اور پانچ غزلیں کہیں۔

'ارمغان حجاز' اقبال کی رحلت کے بعد منظر عام پر آئی اور بداہتہً اس کلام

پر مشتمل ہے جو علامہ نے ۱۹۳۶ء کے بعد ۱۹۳۸ء کے اپریل مہینے تک کہا۔ اس مجموعہ میں اٹھارہ (۱۸) نظمیں، تیرہ (۱۳) رباعیات اور انیس (۱۹) غزلیں ہیں۔

سنین اور کلام کی اس ترتیب سے پتہ چلتا ہے کہ اقبال کا تخلیقی سفر سخت ناہموار رہا ہے۔ اُن کی طبیعت جب روانی پر تھی یعنی جب وہ راتوں کو جاگ کر بھی شعر کہتے تھے اور اُس زمانے میں جب وہ علیل تھے اور فکر شعر ان کے لئے عام طور سے آسان مرحلہ نہیں تھا، اُن کے کلام کی مقدار گراں فک ہے۔ تین برس میں صرف چوبیس (۲۴) نظمیں اور ایک برس میں ایک سو اٹھہتر (۱۷۸) نظمیں اور پانچ (۵) غزلیں۔ یہ بات قرین قیاس لگتی ہے کہ اقبال نے خود یا کسی دوست سے کلام کا انتخاب کروایا ہے اور یقیناً کچھ کلام 'یابس' کی فہرست میں شامل ہو کر خارج ہو گیا ہے۔ متروک کلام کیا ہوا، اس بارے میں کچھ معلوم نہیں۔ ضمناً یہ بات نوٹ کرنے کی ہے کہ نالۂ یتیم اور فریادِ امت جیسی نظمیں اقبال کے کسی مجموعے میں شامل نہیں۔

اقبال کی غزل کے بارے میں ایک بات جس پر توجہ نہیں ہوئی ہے، وہ یہ ہے کہ اقبال نے غزل کا فارم (ہیئت) بدلنے کی شعوری کوششیں کیں۔ کئی غزلوں کے اخیر پر اُن کا دوسرے ردیف وقوافی میں ایک شعر کا اضافہ کرنا یا فارسی کے کسی شعر پر اختتام کرنا اسی طرح اشارہ کرتا ہے۔ "ملازادہ ضیغم لولابی کشمیری کا بیاض" کی پہلی غزل اس بارے میں واضح ثبوت ہے۔ یہ غزل متزاد کے ضمن میں بھی نہیں آتی بلکہ اپنی قسم کی واحد غزل ہے۔ کیا عجب آزاد غزل کے خالق کو اسی غزل سے تحریک وتشویق ملی ہو۔

تمام کچھ کہنے سننے کے بعد ایک ہی حقیقت سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ اقبال مزاجاً غزل کے شاعر تھے۔

✪✪✪

تخلیقی منظر نامہ ـــــ نظم

اقبال کی نظم اپنی ایک نوع اور رنگ رکھتی ہے جس کا تتبع اگرچہ ناممکن نہیں تاہم مشکل ضرور ہے۔ اقبال سے پہلے نظم کا وجود تقریباً نہ ہونے کے برابر تھا کیونکہ رواج اور اعتبار غزل اور قصائد وغیرہ کو حاصل تھا۔ یہ امر تاریخی ہے کہ حالی نے نظم کی صنف کو نہ صرف اپنایا بلکہ اسے سماجی اور تاریخی حقائق کا ترجمان بنایا۔ اس کے باوجود حالی کی مسدس کو الگ رکھ کر جس میں کئی مصرعوں میں جھول یا شعریت کی عدم موجودگی کا احساس ہوتا ہے حالی کے یہاں نظم 'مناجات بیوہ' ہو کر رہ گئی تھی اور تمدنی 'مذہبی یا سماجی معاملات اور مسائل کے راست بیان کا معاملہ تھی۔ انہوں نے جس مسئلے پر نظر کی اسے بعینہٖ 'قرطاس پر اُتارا۔ اِس لحاظ سے حالی فوٹو گرافر تھے مصور نہیں۔ اقبال نے نظم میں مصوری کی' نظم کو آرٹ بنا دیا۔ نظم میں مضامین نو کے نہ صرف انبار لگائے بلکہ ان مضامین میں شدت تاثر پیدا کرنے کیلئے اپنے جذبات' فکر اور آگہی کے رنگ بھی بھر دیئے۔ نظم صرف اقبال کے یہاں دقیق فلسفیانہ اور عارفانہ رموز کے بیان کے ہنر سے واقف ہوئی۔ اس لحاظ سے اقبال جدید نظم کے بھی سالار ٹھہرتے ہیں۔ لگتا ہے اقبال حالی کی نظم سے خاصے متاثر تھے اور انہیں خاص طور سے ''مسدس'' پسند تھی۔ اسے خود پڑھتے تھے اور دوسروں سے پڑھ کر سنانے کی درخواست کرتے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ مسدس سنتے ہوئے وہ اکثر رو بھی پڑتے تھے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ مغربی فکر و نظر نے اس میدان میں ان کی دستگیری کی ہو مگر انگریزی نظم تو 'بلینک ورس' تھی اس نظم کے مماثل کہاں تھی جس نے اقبال کے یہاں ارتقائی منزلیں طے کیں۔ یہ بات قابل توجہ ہے کہ مغربی شعری

روایات سے واقف ہونے کے باوصف اقبال نے 'بلینک ورس' ۔آزاد نظم یا نظم معریٰ کو ہاتھ نہیں لگایا۔ اس سلسلہ میں اُنہوں نے کسی لمعہ صاحب کے نام ۱۰راپریل ۱۹۳۴ء کو لکھے خط میں ان الفاظ میں وضاحت کی ہے:

''سنئے: غزل اور رباعی کیلئے قافیہ کی شرط تو لازمی ہے اگر ردیف بھی بڑھا دی جائے تو سخن میں اور لطف بڑھ جاتا ہے۔ البتہ نظم ردیف کی محتاج نہیں۔ قافیہ تو ہونا چاہئے۔

اب کچھ عرصہ سے بلا ردیف و قافیہ نظمیں لکھی جاتی ہیں اور یہ انگریزی نظموں کی تقلید ہے جس کا نام انگریزی میں بلینک ورس (Blank Verse) ہے جسکو نثر مرجز کہنا چاہئے۔ اگرچہ پبلک مذاق کچھ ایسا ہو چلا ہے مگر میرے خیال میں یہ روش آئندہ مقبول نہ ہوگی۔ نظموں کیلئے اولاً سبجیکٹ اور مضامین تلاش کرنے کی ضرورت ہے نیچرل مضامین تو سبجیکٹ ہی کے اعلیٰ انتخاب سے کچھ لطف دیتے ہیں......''

اقبال کی نظم کے بارے میں پہلے کسی جگہ ہم لکھ چکے ہیں کہ ان کی نظم کی کوالٹی اور ٹیکسچر (quality and texture) ایسا ہے کہ اُس کے کئی اشعار پر غزل کے اشعار کا گماں گزرتا ہے۔ یہ نظم اقبال کی پہلی شناخت ہے:

چمن میں غنچہ گل سے یہ کہہ کر اڑ گئی شبنم
مذاقِ جورِ گلچیں ہو تو پیدا رنگ و بو کر لے
اگر منظور ہو تجھ کو خزاں نا آشنا رہنا
جہان رنگ و بو سے پہلے قطع آرزو کر لے

(نظم پھول)

مذاقِ جورِ گل چیں، قطع آرزو کی تازہ اور بالکل جدید تراکیب سے الگ کیا یہ اشعار غزل کے اشعار نہیں لگتے؟ اسی طرح ''پیوستہ رہ شجر سے اُمید بہار رکھ''

کے عنوان سے جو نظم ''بالِ جبریل'' میں موجود ہے اُس کے یہ دو شعر دیکھئے:

ڈالی گئی جو فصلِ خزاں میں شجر سے ٹوٹ
ممکن نہیں ہری ہو سحابِ بہار سے
جو نغمہ زن تھے خلوتِ اوراق میں طیور
رخصت ہوئے ترے شجرِ سایہ دار سے

''سحابِ بہار، خلوتِ اوراق، شجرِ سایہ دار'' کی تراکیب کی تازگی اور تمثیلیت پر غور کیجئے۔ کیا یہ غزل میں استعمال ہونیوالی تراکیب نہیں اور کیا یہ دو شعر کسی غزل کے قطعہ بند شعر نہیں لگتے؟

اقبال کی نظم کا تجزیہ کرتے ہوئے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ وہ ایک مربوط اور معلوم فکر و فلسفہ سے عبارت ہے۔ اقبال اسلامی تواریخ، قرآن و حدیثِ رسولؐ سے واقف ہونے کی طرح واقف تھے۔ اِن ماخذوں سے اُن کا تعارف ترجموں کے ذریعہ نہیں ہوا تھا بلکہ عربی سے وہ کماحقہ واقف تھے اور راست انداز میں اسلامی فکر و فلسفہ کو سمجھتے تھے۔ اسلام کا بنیادی فلسفہ چونکہ حرکی ہے اور عمل کی اساس پر استوار ہے، اس لئے اقبال کی نظمیہ شاعری عمل اور حرکت کی تحریک و تشویق کے رنگوں سے مزین ہے۔ کائنات، انسان اور خالقِ کائنات کی تکون میں انسان کا زاویہ تلاش اور اس کا درجہ متعین کرنا اقبال کی نظمیہ شاعری کا مقصود ہے:

عقل ہے بے زمام ابھی، عشق ہے بے مقام ابھی
نقش گرِ ازل ترا نقش ہے نا تمام ابھی
خلقِ خدا کی گھات میں رند و فقیہہ و میر و پیر
تیرے جہاں میں ہے وہی گردشِ صبح و شام ابھی

(فرشتوں کا گیت)

؎ گرماؤ غلاموں کا لہو سوزِ یقین سے
کنجِ شکِ فرومایہ کو شاہیں سے لڑا دو

(فرمانِ خدا)

مسکینی و محکومی و نومیدیٔ جاوید
جس کا یہ تصوف ہو وہ اسلام کہ ایجاد

(ہندی اسلام)

محکوم کے الہام سے اللہ بچائے
غارت گر اقوام ہے وہ صورت چنگیز

(الہام اور آزادی)

فطرت کو دکھایا بھی ہے دیکھا بھی ہے تو نے
آئینہ فطرت میں دکھا اپنی خودی بھی

(مصور)

نہ یہ ممکن ہے نہ مقصد کہ اقبال کی نظم کے مضامین کے خمیر کی تجزیاتی تفصیل بیان کی جائے۔ جو اشعار Quote کیے گئے ہیں ان سے اُن کی نظم کے رنگ، اُن کی بوقلمونی ان کے فکر و فلسفہ اور حرکیات کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ اگر کوئی شخص صرف اقبال کی نظموں کے عنوانات ہی پڑھتا جائے تو ہمیں یقین ہے کہ اسے یہ سمجھنے میں کوئی دقت پیش نہیں آئے گی کہ اِن نظموں میں کیا کیا جہان معانی ہیں۔

مغربی اور مشرقی علوم و فنون کے ساتھ ساتھ تواریخ عالم اور تواریخ ادب کے مطالعہ سے یقیناً اقبال نئی جہتوں اور نئے زاویوں سے واقف ہوئے ہوں گے۔ سرسیّد کی تحریک نے ان کے خیالات کو متاثر کیا ہوگا اور حالؔی کے نظریہ شعر کے فلسفے اور اس کے خلوص سے اقبالؔ نے ایک اثر قبول کیا ہوگا یہ بالکل قرین قیاس

ہے تاہم اقبال کی شاعری کا رنگ حالی کی شاعری سے قطعاً جداگانہ ہے اور سرسیّد کی تحریک کے فلسفے کو اُنہوں نے اپنی فکری ترامیم کے بعد ہی اپنایا۔

اقبال کی نظم ایک نگار خانہ ہے اور اس کی ایک عجیب خاصیت یہ ہے کہ وہ ایک اکائی بھی ہے اور کئی اکائیوں کا مجموعہ بھی۔ ویسے نظم کے اشعار کا اندرونی ارتباط ایسا ہونا چاہئے کہ اگر نظم سے کہیں ایک مصرعہ الگ کر دیا جائے تو نظم کے معانی تتر بتر ہونے چاہئیں۔ یہ اچھی نظم کی پہچان ہے۔ گویا یہ نظم کے فن کا معاملہ ہے۔ نظم سے خارج کیا ہوا مصرعہ یا مصرعے، سیاق و سباق کے بغیر بھی کوئی اپنے معانی رکھتے ہوں، یہ اُس نظم کے بے حد اچھا فن پارہ ہونے کا ثبوت ہے۔

اقبال کی نظم ترقی پسندوں نے محض ایک پہلو اور ایک جہت میں اپنائی یعنی جب انہوں نے دیکھا کہ اقبال نے اسلامی، سیاسی، تواریخی، سماجی، آفاقی نظریات کو نظم کے ذریعہ لوگوں تک پہنچایا اور انہیں قبول خاص و عام و عوام حاصل ہوا، تو اُنہوں نے بھی مارکسی تفکر کو عام کرنے کیلئے نظم کو وسیلہ بنایا۔ مگر اس عمل میں اسے یک رُخا بنا دیا۔ اس کے برعکس اقبال کی نظم کے کئی رُخ ہیں اور ایک اور وصف اُن کا یہ ہے کہ وہ کسی ایک رُخ سے مخصوص نہیں، جمعیت اسلامی کے رُخ سے بھی نہیں، جمعیت اسلامی اُن کی نظم کا ایک رُخ ہے اسی لئے اپنی اپنی سطح پر ہر ایک کے لئے قابل قبول ہے۔ ترقی پسند شاعری کا ایک ہی رُخ تھا جو ظاہر ہے کہ ہر ایک کو اپیل بھی نہیں کرتا تھا بلکہ یہ وثوق سے کہا جاسکتا ہے کہ اکثر لوگ اگر اس کو ناپسند نہیں کرتے تھے مگر پسندیدگی کی نظر سے بھی نہیں دیکھتے تھے۔ ایک طرف نظم "مار لے ساتھی جانے نہ پائے" کی منمناہٹ تھی اور دوسری جانب اقبال گرج رہے تھے:

جہاں اگرچہ دگرگوں ہے قم باذن اللہ	وہی زمیں وہی گردوں ہے قم باذن اللہ

کیا نوائے اناالحق کو آتشیں جس نے
تری رگوں میں وہی خوں ہے قم باذن اللہ
غمیں نہ ہو کہ پراگندہ ہے شعور ترا
فرنگیوں کا یہ افسوں ہے قم باذن اللہ
(نظم قم باذن اللہ)

ہر سینہ نشیمن نہیں جبریل امین کا
ہر فکر نہیں طائر فردوس کا صیاد
اس قوم میں ہے شوخی اندیشہ خطرناک
جس قوم کے افراد ہوں ہر بند سے آزاد
(نظم آزادیٔ افکار)

اقبال نظم کے کتنے عظیم شاعر تھے' اسے بیان کرنے کیلئے اُن کی ایک ایک نظم کا الگ الگ تجزیہ کرنے کی ضرورت ہے۔ خیالات وافکار کے حوالے سے اُن کی نظموں کی ترتیب تو اس سلسلہ کی پہلی کڑی ہے۔ اِن نظموں کے فنی پہلوؤں پر ایک علیحدہ دفتر چاہئے نہ جانے ہمیں کیوں محسوس ہوتا ہے کہ نظم اقبال کے یہاں آ کر State of the art کا ایسا ماجرا بن گئی کہ آج بھی ''منت پذیر شانہ'' ہے۔

✪✪✪

تخلیقی منظر نامہ ـــــ فارسی شاعری

یہ عجیب اتفاق ہے کہ دونوں غالبؔ اور اقبالؔ کو اپنی فارسی شاعری پر ناز تھا لیکن دونوں کو شہرت عام اور بقائے دوام اپنے اُردو کلام کی بدولت حاصل ہوئی۔ ایک کو اپنے ''مجموعہ بے رنگ'' کے طفیل اور دوسرے کو اپنی ''نوائے پریشاں'' کے سبب۔ یہ عجیب اتفاق ہے کہ دونوں ''تنگنائے غزل' کے بقدر ظرف' نہ ہونے کے شکوہ سنج تھے مگر دونوں کی غالب پہچان اور شناخت 'غزل' ہے۔ یہ بھی عجیب اتفاق ہے کہ ایران میں اقبال کو 'اقبال لاہوری' کے طور پر یاد کیا جاتا تھا اور غالبؔ کو 'قرم ساق'۔ یعنی دربار شعرائے ایران میں ان کو وہ مقام و منصب نہیں ملا جس کے یہ حقدار تھے۔ ان اتفاقات' کے باوصف یہ حقیقت باقی رہ جاتی ہے کہ دونوں کے فارسی کلام کو کسی طرح نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ اس سلسلہ میں اقبال غالب سے الگ ہیں کیونکہ اقبالؒ نے فارسی شاعری کو اپنے فکر و فلسفہ سے ایک نئے طرزِ ادا' نئے ڈکشن اور اظہار کی نئی سطح سے آگاہ کیا جس کا زندہ و پائندہ ثبوت 'جاوید نامہ' ہے رموز بے خودی ہے' اسرار خودی ہے' پیام مشرق ہے 'ارمغان حجاز ہے۔ فارسی شاعری کے عمومی مطالعہ سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ کم سے کم فارسی گویان ہندی کی شاعری اقبالؒ سے پہلے فکر کی اس سطح سے آشنا ہی نہیں تھی:

گفت مرگِ عقل گفتم ترک فکر گفت مرگِ قلب گفتم ترک ذکر

گفت دینِ عامیاں گفتم شنید گفت دین عارفان گفتم کہ دید

(جاوید نامہ)

اے کہ ز خود گشتہ' خار و خس چمن مشو
منکر او اگر شدی' منکر خویشتن مشو

اے سوار اشہب دوراں بیا اے فروغ دیدۂ اِمکاں بیا
بذہ باش و بر زمیں رو چوں سمند چوں جنازہ نے کہ بر گردن برند

عقل بدام آورد فطرت چالاک را
اہر منِ شعلہ زاد' سجدہ کند خاک را

(پیام مشرق)

حریف ضرب او مردِ تمام است کہ آں آتش نسب والا مقام است

[ارمغان حجاز (فارسی)]

فارسی شاعری کا عام احوال صوفیانہ اور عاشقانہ تھا' پندو نصائح اور تمثیلی طرز بیان سے عبارت تھا اور اسلام کے فلسفہ تحرک (فعالیت) اور خودی کے رنگوں سے یہ شاعری عام طور سے واقف نہیں تھی۔ اس میں آتش نسب' کے والا مقام ہونے کی کوئی تپش نہیں تھی۔ یہ موقعہ نہیں ہے کہ اقبال اور قدیم فارسی شاعروں کا تقابلی تجزیہ پیش کیا جائے مگر صرف یہ کہہ کر کہ اُردو میں غزل اور نظم کو جس طرح اقبال نے فکری اور فنی سطح پر انقلاب آشنا کیا' اسی طرح فارسی شاعری کو بھی انہوں نے نئی جہتوں' نئی وسعتوں اور نئے زاویوں سے روشناس کیا۔

اقبال کے تذکرہ نگاروں نے لکھا ہے کہ اقبال ۱۹۰۵ء سے پہلے فارسی میں شعر لکھنے لگے تھے۔ شیخ عبدالقادر' جو رسالہ ''مخزن'' کے مدیر تھے کہتے ہیں:

''جس چھوٹے سے واقعہ سے ان کی فارسی گوئی کی ابتداء ہوئی' وہ یہ ہے کہ ایک مرتبہ وہ ایک دوست کے ہاں مدعو تھے جہاں اُن سے فارسی اشعار سنانے کی فرمائش ہوئی اور پوچھا گیا کہ وہ فارسی شعر بھی

کہتے ہیں یا نہیں۔ انہیں اعتراف کرنا پڑا کہ سوائے ایک آدھ شعر کے فارسی لکھنے کی کوشش نہیں کی مگر کچھ ایسا وقت تھا اور اس فرمائش نے ایسی تحریک ان کے دل میں پیدا کی کہ دعوت سے واپس آ کر بستر پر لیٹے ہوئے باقی وقت وہ شاید فارسی اشعار کہتے رہے اور صبح اٹھتے ہی جو مجھ سے ملے تو دو تازہ غزلیں فارسی میں تیار تھیں"

شیخ صاحب کے مطابق فارسی میں شعر کہنے کی جانب اقبال کی طبیعت اس لئے راغب ہوئی کہ اقبال کو دقیق فلسفیانہ خیالات کے اظہار کے باب میں محسوس ہوا کہ اُردو اس کی متحمل نہیں ہو سکتی۔ اس خیال سے نہایت عجز وانکسار کے ساتھ اختلاف کیا جا سکتا ہے کیونکہ جو شاعر فلسفہ اور اعلیٰ فکر کی حامل شاعری اُردو میں کر سکتا ہے، جس کی مثال مسجد قرطبہ، ساقی نامہ، جاوید سے، ابلیس کی مجلس شوریٰ اور دوسری کئی نظمیں ہیں، وہ یہ سوچ ہی نہیں سکتا تھا کہ فارسی میں وہ زیادہ بہتر سطح سے اپنی بات کہہ سکتا ہے۔ فارسی زبان میں شعر کہنے کیلئے یہ جواز تراشنا اُردو کے ساتھ صریح زیادتی ہے۔ ہم اندازہ کر سکتے ہیں کہ فارسی میں شعر کہنے کی تحریک و تشویق اقبال کو غالب اور غنیؔ کاشمیری سے ملی ہو گی جس طرح انہوں نے اُردو میں ظریفانہ کلام 'صحبت اکبر' کے اثر میں لکھا۔ غنی کاشمیری ایران میں اور ان علاقوں میں جہاں فارسی زبان بولی جاتی ہے، آج بھی مشہور و معروف ہیں۔ غنی کے تخیلی منظرنامہ کے مقابلے میں اقبال کے سامنے ایک بڑا فکری کینواس تھا اس لئے انسانی نفسیات کے حوالے سے یہ بعید از قیاس نہیں کہ انہوں نے اپنے جوہر کو آزمانے کیلئے یا غنیؔ یا غالبؔ کا سا مقام پانے کی خواہش میں فارسی زبان میں بھی شعر کہے۔ مزید: فارسی اقبال کے زمانے تک اہل علم اور شرفاء میں خاصی مقبول تھی کیونکہ فارسی صدیوں تک درباری زبان رہی تھی اور دربار کو مٹے ہوئے نصف

صدی بھی نہیں گزری تھی۔ اس لئے واضح ہے کہ اقبال نے چاہا ہوگا کہ وہ اپنے خیالات معاشرے کے اس قابل قدر حصے تک پہنچائیں اور پذیرائی حاصل کریں۔ اگر شیخ عبدالقادر صاحب کی بات من وعن تسلیم کی جائے تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ اقبال نے عربی زبان کو کیوں وسیلۂ اظہار نہیں بنایا تاکہ انکے خیالات زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچ جاتے۔ فارسی زبان بہر صورت ایران کے علاوہ ایران کے آس پاس کے چند ہی دوسرے علاقوں کی زبان تھی (ہے) اس کے برعکس عربی تمام عرب ممالک کی زبان تھی (ہے)۔ عجیب ہے کہ اقبال نے نہ برصغیر کے کروڑوں لوگوں کو جن میں کروڑوں مسلمان بھی شامل تھے (ہیں) اس قابل سمجھا کہ ان تک "دقیق نکتہ ہائے اسرار" پہنچ جائیں۔ نہ عرب ممالک میں رہنے والے کروڑوں مسلمانوں کو ہی انہوں نے اپنے پیغام سے آشنا کرنے کی ضرورت سمجھی۔ وہ عربی زبان سے بخوبی واقف تھے' پھر فارسی ہی کا انتخاب کیوں کیا' یہ بات سمجھ نہیں آتی۔ اس عندیے کے ثبوت میں کہ اقبال اُردو میں اپنے خیالات کو بہتر انداز میں یا کم سے کم فارسی کے مقابلے میں کم بہتر انداز میں نہیں بلکہ برابر کی سطح سے اظہار کرنے پر قادر تھے' اُن کے اُردو کلام سے ایک اور فارسی سے ایک شعر پیش کیا جاتا ہے۔: فارسی میں وہ کہتے ہیں:

؎ بر لبم از وصل می ناید سخن   وصل گر خواہم نہ او ماند نہ من

"وصل اور ہجر" کے نکتہ دقیق کی کتنی خوبصورت دلگداز اور خیال انگیز تشریح کی گئی ہے۔ یعنی وصل وجود کو فنا کرسکتا ہے اور ہجر وجود کو بنائے رکھتا ہے: اب اُردو میں دیکھئے اسی خیال کو کس انداز اور وسیع تر معنوں میں بیان کیا گیا ہے

؎ عالم سوز و ساز میں' وصل سے بڑھ کے ہے فراق
وصل میں مرگ آرزو' ہجر میں لذّتِ طلب

اس مختصر سی گزارش سے شاید یہ بات واضح ہوئی ہو کہ فارسی میں شعر کہنے کی ضرورت 'دقیق نکتہ ہائے فکر' کے بیان کیلئے پیش نہیں آئی بلکہ دستور زمانہ کی پیروی میں اور فارسی گویان ہندی میں شامل ہونے کی غرض سے۔ ویسے آج جب کہ فارسی کا محاورہ اور مزاج بدل چکا ہے' اقبالؒ کا مقام و مرتبہ' ایرانی شاعروں کے مقابلے میں کیا ہے' وہ تحقیق طلب ہے۔ اُردو میں اقبال بہر حال عظیم شاعر کی مسند اور منصب پر بیٹھے ہوئے ہیں۔ مقصد اس بحث سے علامہ کے فارسی اور اُردو کلام کا احاطہ اور موازنہ کرنے کی جسارت کرنا نہیں (ہر چند کہ اس ضمن میں کام کرنیکی گنجائش موجود ہے) مگر صرف یہ بتانا ہے کہ فارسی کلام میں بھی علامہ نے نقش ہائے رنگ رنگ' مرتب اور مرتسم کئے ہیں جن سے 'بگوز' کا حوصلہ نہیں کیا جا سکتا۔

می شود پردۂ چشمم پر گاہے گاہے

دیدہ ام ہر دو جہاں را بہ نگاہے گاہے

وادیٔ عشق بسے دور و دراز است ولے

طے شود جادۂ صد سالہ بہ آہے گاہے

فارسی زبان کی شاعری کے حوالے سے واقعی اقبال نے جادۂ صد سالہ بہ آہے' طے کیا۔

●●●

اقبال۔ بچّوں کی دُنیا میں

یہ عجیب بات ہے کہ مغربی مصنّفین کے مقابلہ میں برصغیر ہندو پاک کے مصنّفین نے بچوں کیلئے ادب تخلیق کرنے میں کوئی قابل قدر کام نہیں کیا ہے۔ یہ نہیں کہ ان مصنّفین کو یہ ادراک نہیں تھا (ہے) کہ بچے قوم کی مستقبل کے معمار ہی نہیں بلکہ بقاء کی ضمانت ہوتے ہیں لیکن کیا کہا جائے کہ بچوں کیلئے ادب تخلیق کرنے میں انہیں کیوں سبکی کا احساس ہوتا رہا (ہے) سبک محسوس کرنے کے علاوہ اس اہم ضرورت سے مصنّفین کے صرف نظر کرنے کی دوسری کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی۔

خلیل جبران کا دعویٰ تھا کہ وہ کسی بچے کو دیکھ کر اس کی ماں کے معیار فکر و عمل اور اس ماں کو دیکھ کر اس کی قوم کی شناخت کر سکتے تھے۔ کوئی قوم عورتوں کو کیا مقام دیتی ہے اور ان کے ساتھ کتنا اچھا یا برا سلوک روا رکھتی ہے' اسی کے اثرات بداہتہً بچوں پر بھی مرتب اور مرتسم ہوتے ہیں۔ بچوں کی تربیت اقدار عالیہ کی اساس پر کی گئی ہو تو قوم کی ترقی اور بقا یقینی بن جاتی ہے۔ اقدار عالیہ ظاہر ہے' محبت' اخوت' ایثار' رواداری' حوصلہ' ہمت' مروت' مؤدت' ہمدردی' کچھ اچھا کرنے کی امنگ اور تڑپ کے ذریعہ انسانی معاشرے میں امن وسکون کی فضا قائم کرنے اور قائم رکھنے کیلئے پر خلوص سعی اور کمٹمنٹ کا معاملہ اور ماجرا ہیں۔ لہٰذا اگر 'کل' کی دنیا سے اور 'کل' کی دنیا کو آج کی دنیا سے بہتر بنانا مقصود ہو تو بچوں کی جسمانی' ذہنی اور اخلاقی تہذیب و تربیت کرنے سے کوئی مغرف نہیں۔ آج کل مصیبت یہ آن پڑی ہے کہ ساری توجہ بچوں کی جسمانی تہذیب پر صرف کی جاتی

ہے اور اخلاقی سطح پر انکی ذہنی تہذیب عام طور سے ناقابل توجہ ٹھہری ہے۔ تعلیمی سطح پر وہ مخصوص نصاب کورٹ کرڈگری حاصل کرتے ہیں اور کسی دفتر کی چھوٹی بڑی میز کے پیچھے کسی چھوٹی بڑی کرسی میں دھنس کر پوری زندگی اسی حالت میں گزارتے ہیں اور کتابوں کی دُنیا سے پرے دیکھنے کی سکت اور حوصلے سے عاری رہتے ہیں۔ ہمارے اکثر بچے' اپنے والدین کی خواہش کی تکمیل میں انگریزی زبان میں دو حرف لکھنے پڑھنے اور بولنے میں اپنا سارا ذہنی اور جسمانی زور صرف کردیتے ہیں اور انسانی معاشرے کے تئیں اپنی ذمہ داریوں سے نہ وہ آگاہ ہوتے ہیں نہ انہیں اس کا احساس دلایا جاتا ہے۔ مقصد یہ نہیں کہ اس موضوع کی صراحت میں پورا مضمون لکھا جائے' مقصود یہ ہے کہ بچوں کا ایسا ادب' جس میں ہمارے تمدن' تہذیب' معاشرے' ہماری روایات اور تواریخ کے رنگ بولتے ہوں' تخلیق کرنے کی جانب فوری توجہ کرنے پر مصنفین کو آمادہ کیا جائے۔ شاید ہمارے عظیم شاعر علامہ کو اس کا احساس تھا' اسی لئے انہوں نے مٹھی بھر ہی سہی' بچوں کیلئے اشعار کہے۔ ان اشعار کا انداز و آہنگ اور فکر یکسر الگ ہے۔ جن چند شاعروں نے بچوں کے لئے شعر کہے اور اچھے شعر کہے' اقبال کے اشعار ان کے مقابلے میں ایک بے پایاں جہان معنی لئے ہوئے ہیں اور بچوں کی تربیت کن خطوط پر ہونی چاہئے ان کے خدوخال واضح کرتے ہیں۔ یہ خطوط اقدار رعایہ کے رنگوں سے مزین ہیں۔

لب پہ آتی ہے دُنیا بن کے تمنا میری زندگی شمع کی صورت ہو خدایا میری۔

ہیں لوگ وہیں جہاں میں اچھے (بچے کی دعا)

آتے ہیں جو کام دوسروں کے

بچوں کے لئے اقبال کی لکھی ہوئی نظموں کے اشعار کی تشریح کا یہ موقعہ نہیں لیکن ان دو اشعار کے ذریعہ دیکھئے بچوں کے ذہن کو کن اقدار کا آئینہ دار

ہونے کا درس دیا گیا ہے۔ بچے کی تمنا کیا ہے؟ دیکھئے بچہ اور تمنا' تمنائیں ambitions تو زندگی کا وہ رنگ ہیں جن سے زندگی کی راہیں متعین ہو جاتی ہیں۔ بچے کی دعا سے معلوم ہوتا ہے کہ بچے کے ذہن میں زندگی کرنے کا حوصلہ بھی ہے اور خواہش بھی اسی لئے اس کے دل میں ایک تمنا پیدا ہو گئی ہے کہ اسے ایسی زندگی ملے جو شمع کی صورت ہو۔ شمع کا منصب روشنی فراہم کرنا ہے اور شمع جلائی ہی جاتی ہے جب اندھیرا چھا جاتا ہے اور جب تک اندھیرا رہتا ہے وہ جلتی رہتی ہے اور روشنی کرتی رہتی ہے۔ اندھیرا: ظلم' جبر' تشدد' منافرت' دوئی' فساد' فتنہ' کشت وخوں' عدم مساوات' استحصال' محکومی کی علامت ہے تو شمع: صاحب نظر' باہمت' باحوصلہ' محبت نواز' صاحب ایثار' بامروت' ہمدرد' اپنی جان پر کھیل کر دوسرے کو غم واندوہ سے نجات دلانے والے کی علامت بن جاتی ہے۔ دعا اس لحاظ سے رات کے اندھیروں میں جلنے والی شمع سے متعلق نہیں بلکہ زندگی کے حقیقی اندھیروں کو دور کرنے کی ہمت اور حوصلہ کی دعا ہے۔

ہو مرا کام غریبوں کی حمایت کرنا درد مندوں سے ضعیفوں سے محبت کرنا

واضح اور مثبت انداز میں آئین زندگی کی ترتیب کی خواہش کی مظہر دعا:

جگنو جیسے ذرا سے چمکنے والے کیڑے نے اپنے سے کئی گنا بڑے وجود' بلبل کو بے چارگی کے عالم میں دیکھا تو اُس کی مدد پر آمادہ ہو گیا کیونکہ اس کا ایمان ہے کہ وہی لوگ اچھے ہوتے ہیں جو دوسرے کے کام آتے ہیں۔ اسی لئے اس نے اندھیری رات میں اپنی روشنی سے بلبل کی راہ روشن کی اور اسے اس کے آشیانے تک پہنچا دیا۔ یہ کہہ کر کہ

حاضر ہوں مدد کو جان و دل سے کیڑا ہوں اگرچہ میں ذرا سا

جگنو نے اپنے چھوٹے سے وجود کو کتنا بڑا بنا دیا ہے۔ اپنے وجود کے

مقصد سے واقف ہونا ہی تو اصل حیات اور مقصدِ حیات ہے۔ اس فلسفے کا سبق 'جگنو' اس وضاحت کے ساتھ دیتا ہے کہ کوئی وجود حقیر نہیں بلکہ ہر وجود کا ایک مقصد اور معنی ہے۔

اتنا بڑا فلسفہ' اتنا بڑا پیغام' اتنے سادہ و پرُکار لفظوں میں' اثر آفرینی کو جلو میں لئے ہوئے' یہی شعر اقبال کا اعجاز اور اس کے فن کے فراز کی شناخت ہے۔

آزادیاں کہاں وہ اب اپنے گھونسلے کی
اپنی خوشی سے جانا اپنی خوشی سے آنا

(پرندے کی فریاد)

یہ نظم اتنی تہہ دار اور معنی کے اعتبار سے وسعتوں کی حامل ہے کہ سوچتے ہی بنتی ہے۔ جمہوری طرز حکومت میں کئی عیب سہی مگر ہزار عیوب کے مقابلے میں اس کا ایک وصف ہی ہے کہ یہ فرد کی آزادی' نقل و حمل اور تحریر و تقریر کی ضامن ہے۔ جس جمہوریت میں یہ آزادی فراہم نہیں' اس میں چاہے دودھ کی نہریں بہتی ہوں اور زمین پر کہکشاں بجتی ہو' جمہوریت نہیں۔ غلامی وسیع تر معنوں میں کیا ہے؟ یہی چلنے پھرنے پر پابندی اور تحریر و تقریر پر قدغن۔ پرندے کا یہ کہنا کہ اس سے اپنی مرضی سے جانے اور اپنی خواہش کے مطابق واپس آنے کی آزادی چھن گئی ہے' اسی لئے وہ سراپا فریاد ہے' آزادی کی محافظت کرنے کا پیغام دیتا ہے تا کہ "آتا ہے یاد مجھ کو گزرا ہوا زمانہ" کہتے ہوئے نوحہ کناں نہ ہونا پڑے۔

نظم 'ایک مکڑا اور مکھی' بچوں کو یہ درس دیتی ہے کہ وہ کبھی خوشامد میں نہ آئیں اور خوشامد کو مطلب برآری کا وسیلہ نہ بنائیں کیونکہ خوشامد بڑے سے بڑے دانا کو بھی اپنے منصب اور مرتبے سے گرا دیتی ہے اور اسے وسیلہ بنانا مذموم ہے کیونکہ ساری نظم پڑھ کر مکڑے کی ذات سے نفرت کا جذبہ ابھرتا ہے اور مکھی کے

ساتھ ہمدردی۔ اس نظم میں بین السطور یہ پیغام بھی ہے کہ دھوکہ دینے سے دھوکہ کھانا بہتر ہے۔

''ایک پہاڑ اور گلہری'' کی داستان سے یہ سبق ملتا ہے کہ اس کائنات میں ہر وجود کا اپنا معنی اور مقصد ہے۔ بڑے کے جحم سے چھوٹے کا پست ہونا ثابت نہیں کیا جاسکتا۔ پہاڑ بڑا ہے مگر اس کی علت یہ ہے کہ جامد ہے۔ گلہری چھوٹی ہے مگر متحرک اور فعال ہے۔ مزید یہ کہ وجود سے زیادہ وجود کے مقصد پر توجہ مرکوز رہنی چاہئے کیوں کہ ۔

نہیں ہے چیز نکمی کوئی زمانے میں   کوئی برا نہیں قدرت کے کارخانے میں

قرآن حکیم میں بسا جگہ 'کافر' کا لفظ 'ناشکرے' (Ungrateful) کے معنی میں آیا ہے۔ ناشکری گناہِ عظیم ہے اور اسلامی فلسفہ کے مطابق جو شخص لوگوں کا شکر گزار نہیں ہوتا وہ اللہ کا شکر گزار بھی نہیں ہوسکتا۔ ''ایک گائے اور بکری'' کے عنوان سے نظم میں بکری، گائے کو شکر گزاری کا درس دے کر زندگی کو زیادہ اطمینان کے ساتھ گزارنے کی تحریک و تشویق فراہم کرتی ہے۔ وہ اس سے کہتی ہے کہ آدمی کی شکایت کے بجائے اس کی شکر گزاری واجب ہے کیونکہ وہی چراگاہوں میں ہری گھاس اُگاتا ہے، ٹھنڈی ہواؤں سے ہمارا تمہارا وجود سرشار و شاداب کرنے کی سبیل کرتا ہے اور سایہ فراہم کرتا ہے وغیرہ ۔

یہ چراگہہ یہ ٹھنڈی ہوا   یہ ہری گھاس اور یہ سایا
ایسی خوشیاں ہمیں نصیب کہاں   یہ کہاں بے زباں غریب کہاں
یہ مزے آدمی کے دم سے ہیں   لطف سارے اُسی کے دم سے ہیں

اس نظم پر اس حوالے سے کہ 'شکر' کے ذریعہ 'شاکر' ہونے کا درس تو قرآن دیتا ہے، کوئی غور کرے تو اس نظم کے ابعاد وسیع ہوجائیں گے۔ اللہ سورۂ الرحمٰن میں

مکرر ارشاد فرماتے ہیں کہ "تم کس کس نعمت کی تکذیب کر سکتے ہو"۔ اللہ نے واقعی انسان کے لئے اتنی نعمتیں اس کرہ ارض پر پیدا کی ہیں کہ ان کا شمار نہیں کیا جا سکتا۔

"ہندوستانی بچوں" کیلئے قومی گیت لکھ کر اقبال نے اخوت، رواداری اور محبت کا کتنے جانفزا انداز میں پیغام دیا ہے:

وحدت کی لے سنی تھی دنیا نے جس مکاں سے
میرِ عربؐ کو آئی ٹھنڈی ہوا جہاں سے
میرا وطن وہی ہے، میرا وطن وہی ہے

مذکورہ مٹھی بھر نظموں کے ذریعہ اقبال نے بچوں کی ذہنی سطح پر تہذیب و تربیت کی راہیں روشن کی ہیں۔ بچوں کو اِن نظموں کے بطن میں رواں پیغام سے آشنا کرایا جائے تو یقیناً وہ قوم کے مستقبل اور بقا کی ضمانت فراہم کرنے کے قابل ہو جائیں گے۔

اِن نظموں کا ایک خاص وصف یہ ہے کہ اِن میں بچے مخاطب نہیں، محض ان نظموں کے عنوانات انہیں بچوں سے مختص اور منسوب کرتے ہیں۔ نظم "بچے کی دعا" اور "ماں کا خواب" اس عندیے کی تصدیق کرتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ اگر اقبالؒ نے بچوں کیلئے شاعری پر توجہ کی ہوتی تو بہت بڑا کام ہوا ہوتا۔ جس سہل انداز میں اقبال نے اقدارِ عالیہ سے بچوں کو بہرہ ور کیا ہے، وہ بچوں کی شاعری کیلئے ایک پیش رفت کا اشارہ فراہم کرتا ہے، جسے ایک نئے اقبال کا انتظار ہے۔

●●●

شاعرِ آفاق

اقبال یقیناً ایک نابغۂ روزگار اور ایک عبقری شخصیت کے مالک تھے۔ تاہم اس عظیم شاعر، مفکر اور فلسفہ دان کو 'حکیم الامت' اور 'شاعر مشرق' کے القابات میں محدود کرنے کی سعی کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی گئی اور اس عمل پر اصرار جاری ہے۔ کلامِ اقبال کا بالاستیعاب مطالعہ اس ناقابل تردید حقیقت کی جانب رہنمائی کرتا ہے کہ اقبال آفاقی فکر و نظر کے ترجمان تھے۔ ان کے کلام سے کچھ انہیں اشتراکی، کچھ انہیں تفضیلی، کچھ انہیں صرف مسلمانوں کے ترجمان اور کچھ انہیں اپنے مسلک اور نظریہ کا حامی ٹھہراتے ہیں۔ شاید یہ بذاتِ خود ان کے آفاقی ہونے کی دلیل ہے۔ کچھ لوگوں کا یہ کہنا کہ یورپ سے واپسی کے بعد ان کے کلام کا 'لب و لہجہ' بدل گیا اور وہ وسعتوں کو چھوڑ کر وادیوں میں سمٹ گئے اس لحاظ سے صحیح نہیں معلوم ہوتا کہ حقیقت اگر ایسی ہی ہوتی تو اقبالؒ ۱۹۳۵ء میں ''بانگِ درا'' میں وہ کلام شامل نہ رکھتے جو انہوں نے ۱۹۰۵ء تک کہا تھا اور پھر ۱۹۰۸ء سے لے کر ۱۹۲۴ء تک کہا تھا۔ ان کیلئے ایسا کرنا ممکن بھی نہیں تھا کیونکہ نانک کے نغمۂ وحدت اور چشتیؒ کے پیغام حق کی نہ نوعیت بدل گئی تھی اور نہ معانی۔ نہ یہ حقیقت بدل گئی تھی کہ میر عربؐ کو اقبال کے وطن سے ٹھنڈی ہوا آئی تھی۔ 'سوامی رام تیرتھ' پر نظم انہوں نے ۱۹۰۵ء اور ۱۹۰۸ء کے درمیان لکھی جب وہ یورپ میں تھے۔ واپس آنے پر:

آہ کھولا کس ادا سے تُو نے رازِ رنگ و بُو
میں ابھی تک ہوں اسیر امتیاز رنگ و بُو

’سوامی رام تیرتھ‘ کا یہ وصف نہیں بدلا تھا ’’سرگزشت آدم‘‘ میں حضرت آدم سے لے کر ’کیوپرنکس‘ تک انسان کے جو اوصاف بیان ہوئے ہیں وہ ایک نیا اندازِ نظر اپنانے سے تو بدل نہیں سکتے تھے؟ ۱۹۰۸ء اور ۱۹۲۴ء کے درمیان ’رام‘ کے بارے میں یہ خیال کہ:

تلوار کا دھنی تھا‘ شجاعت میں فرد تھا
پاکیزگی میں‘ جوشِ محبت میں فرد تھا

کیسے اپنے معانی بدل دیتا۔ نانک صدائے توحید بلند کرنے والے مردِ کامل کے منصب سے کس وجہ سے دستبردار ہو سکتے تھے۔

قوم نے پیغام گوتم کی ذرا پروا نہ کی قدر پہچانی نہ اپنے گوہر یک دانہ کی

......

پھر اٹھی آخر صدا توحید کی پنجاب سے
ہند کو اک مردِ کامل نے جگایا خواب سے

شیکسپیئر کے اسرار کا راز داں ہونے سے اقبال کیسے انکار کر پاتے۔

ان نظموں کے ہوتے ہوئے جیسے کوئی یہ ثابت نہیں کر سکتا ہے کہ اقبال کا طرزِ فکر بدل گیا تھا ویسے ہی ’طلوع اسلام‘ ’مذہب‘ ’جنگ یرموک کا ایک واقعہ‘ اور ایسی دوسری نظموں کے حوالے سے کوئی غیر مسلم انہیں ’متعصب مسلمان‘ ثابت نہیں کر سکتا۔

یہ صحیح ہے کہ اقبال نے مسلمانوں میں ایک نئی روح پھونکنے کے جتن کئے۔ ان کے اِس عمل کا واضح مقصد تھا۔ وہ مسلمانوں کو انسانی معاشرے کی تعمیر و ترقی میں ایک مثبت اور بامعنی کردار ادا کرنے کی ترغیب دینا چاہتے ہیں۔ وہ دیکھ رہے تھے کہ مسلماں زبوں حالی‘ غربت‘ بیماری‘ بے کاری‘ تعلیمی پس ماندگی اور

مایوسی کی چکی میں پس رہے ہیں اور ۱۸۵۷ء کے بعد ان پر ایک قسم کا احساس محرومی طاری ہو چکا ہے جسے انگریزوں نے ہر طرح سے مزید گہرا کر دیا۔ 'مسجد قرطبہ' کو دیکھ کر اس مفکر نے یقیناً سوچا ہوگا کہ وہ اسباب وعلل کیا تھے' جن کی بنیاد پر یہ عظیم مسجد تعمیر ہوئی اور وہ وجوہات کیا تھے' جو اس مسجد کی ویرانی کا سبب بنے۔ یہ انسانی نفسیات کے حدود سے بعید نہیں۔ وہ آفاقی یقیناً تھے مگر اپنے ''گھر'' سے کس طرح نظریں پھیر کر رہتے۔ بہت سارے مغربی شاعروں نے اپنی شاعری کو عیسائیت کے پرچار کا ذریعہ بنایا لیکن غیر عیسائیوں نے ان پر تعصب یا تنگ نظری کا کوئی الزام نہیں لگایا اور نہ ہی ان کو ایسے القاب وخطابات سے نوازا کہ وہ عیسائیوں کے بغیر باقی سب کے لئے غیر متعلق ہو جاتے۔ برٹش گورنمنٹ نے اقبال کو بین الاقوامی جمعیت کا نظریہ پیش کرنے اور اسے فروغ دینے کے لئے ''سر'' کا خطاب نہیں دیا۔ ان کے نزدیک اقبال ایک مفکر تھے اور ایک عظیم شاعر تھے۔ جو اس خطاب کے سزاوار تھے ورنہ فرنگیوں کے خلاف جو کچھ اور جتنا کچھ اقبال نے لکھا اور کہا' اس کے پیش نظر برٹش گورنمنٹ کا جواز بنتا تھا کہ وہ انہیں اس اعزاز سے نہ نوازے۔ کلام اقبال سے ان کے خطبات سے' ان کے خطوط اور دوسری تحریروں سے سینکڑوں مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں جو یہ ثابت کرتی ہیں کہ وہ صرف حکیم الامت اور شاعر مشرق نہیں تھے بلکہ ان کا فکر' اس فکر کی جہتیں اور اس فکر کے رنگ آفاقی تھے (ہیں) تاہم یہ آفاقی شخصیت اپنی ہی قوم کے ادبار سے لاتعلق نہیں رہ سکتی تھی اور اس حقیقت سے چشم پوشی نہیں کرسکتی تھی کہ ہندوستان ہی میں ان کا شیرازہ منتشر اور پراگندہ نہیں تھا بلکہ دُنیا میں وہ جہاں بھی آباد تھی' اس کا وجود حقیر ہو کر رہ گیا تھا۔ اس میں زندگی کرنے کی تڑپ پیدا کرنے کیلئے سعی کرنا کسی طرح مذہبی منافرت' دوئی' تعصب' فتنہ وفساد پر اسے اکسانا نہیں تھا۔ وہ

درویش خدامست کے ''نہ شرقی نہ غربی'' ہونے کے روادار تھے اور دلی وصفاہان و سمرقند کو بھی اپنا گھر نہیں سمجھتے تھے بلکہ پوری دُنیا کو اپنا وطن سمجھتے تھے۔ 'علم الاقتصاد' میں معاشیات سے بحث کرتے ہوئے انہوں نے لکھا ہے کہ مذہب کو اگر معاشیات سے الگ رکھا جائے تو مذہب روحانی بالیدگی کی راہوں میں رہنمائی تو کرسکتا ہے مگر انسان کے معاشی مسائل کا حل فراہم نہیں کرسکتا اور معاشی مسائل مذہبی اعتقادات کو کھوکھلا کر سکتے ہیں۔ وہ یقیناً یہ سمجھتے تھے کہ مسلمانوں کیلئے صنعت وحرفت، تعلیم، تجارت کے ذریعہ اپنی سماجی زندگی کو اس انداز سے سنوارنا ضروری ہے کہ وہ معاشرہ میں ترقی کے عمل میں برابر کے شریک بن سکیں، جیسے کہ ان کے آباء تھے، اِس لئے انہوں نے مخصوص انداز میں ان کو اپنا مخاطب بنایا۔ اِس فلسفہ کے تجرباتی عمل کے نتیجے میں یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ یہ نظریہ بھی انسانی معاشرے کی بہتری سے جڑا ہوا تھا۔ اس کی مثال یہ ہے کہ اگر کوئی ڈاکٹر کسی بیمار سے یہ کہے کہ تمبا کو نوشی صحت کیلئے مضر ہے تو وہ صلاح گو کہ بیمار سے مختص ہے مگر دوسرے سننے والوں پر بھی اس کا اطلاق ہو سکتا ہے اور اگر وہ اس صلاح کو اپنائیں تو ان پر اس کا برعکس اثر مرتب نہیں ہوگا۔ اقبال کی ساری شاعری کا حال احوال یہی ہے۔ وہ مشرق میں رہتے تھے اس لئے بجا طور پر شاعر مشرق تھے، انہوں نے مسلمانوں کی سماجی اور سیاسی بیداری کیلئے قلم اٹھایا اِس لئے وہ حکیم الامت کہلائے تھے۔ وہ اصلاً آفاقی فکر وخیال کے علمبردار ایسے حکیم تھے جس کے نسخے 'بیماروں' کے ہی لئے نہیں دوسروں کیلئے بھی یکساں طور پر فائدہ مند تھے۔

اقبال سے زیادہ اِس بات کا ادراک اور احساس کسے ہو سکتا تھا کہ اسلام تنگ نظری، نسلی اور علاقائی عصبیت، تعصب جیسی علتوں اور ذلتوں کے خلاف فکری اور نظریاتی سطح پر جہاد کا نام ہے۔ انہیں خبر تھی کہ قرآن کے مطابق اللہ، اس کے

ملائکہ پر، اس کے صحیفوں پر، اس کے تمام پیغمبروں پر ان میں کوئی فرق کیے بغیر اور روزِ آخرت پر ایمان لانا ہی ایمان ہے۔ اور یہ ایمان بین الاقوامی صلح کل کا عہد نامہ ہے اور یہی اتحادِ آدم کا چارٹر ہے۔

اس دور میں اقوام کی صحبت بھی ہوئی عام
پوشیدہ نگاہوں سے رہی وحدتِ آدم
تفریق ملل حکمتِ افرنگ کا مقصود
اسلام کا مقصود فقط ملتِ آدم

اقبال پر بین الاسلامی نظریہ کی حمایت کے حوالے سے جو لوگ اعتراض کرتے ہیں ان پر شاید یہ رمز نہیں کھلا ہے کہ جمعیتِ اسلامی ہی جمعیتِ آدم کیلئے راہ ہموار کر سکتی تھی (ہے) کیونکہ اسلام کا مقصود جمعیتِ اقوام سے کہیں زیادہ جمعیتِ آدم ہے۔

مکہ نے دِیا خاکِ جنیوا کو یہ پیغام
جمعیتِ اقوام کہ جمعیتِ آدم!

اسلام کی نظر میں انسان ناقابل تقسیم اکائی ہے اور "لقد خلقنا الانسان فی احسن تقویم" کی تجسیم ہے۔ یہ اکائی کئی دہائیوں میں بٹی ہوئی ہے۔ مذہب کے نام پر علاقے کے حوالے سے، رنگ کی بناء پر، ذات کے توسط اور نسل کی اساس پر۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ایک ہی ملک میں رہنے والے لوگ بھی آپس میں متضاد اور متخالف طرزِ فکر و عمل کے اسیر ہیں۔ تضاد اور اختلاف، نظریاتی سطح پر اختلاف رکھنے والوں کے درمیان ہی نہیں ایک نظریہ رکھنے والوں کے درمیان بھی جاری و ساری ہے۔ جمعیتِ آدم کا اتنا بڑا مقصد صرف اُس صورت میں حاصل ہو سکتا ہے جب جمعیت کا عمل ایک گھر سے شروع ہو کر ایک محلے کے

لوگوں میں فروغ پائے، پھر ضلع، صوبہ، ریاست اور ملک کی سطح کے بعد عالمی سطح پر مقبول ہو۔ اقبال نے، جیسا پہلے عرض کیا جا چکا ہے، اپنے ''گھر'' (یعنی مسلمانوں میں جو مسلکوں کے اعتبار سے کئی فرقوں میں بٹے ہوئے تھے (ہیں) اس اتحاد کا عمل انگیخت کرنے کا بیڑہ اٹھایا۔ کیونکہ اسی ''گھر'' کا اتحاد، جمعیت آدم کا ضامن بن سکتا ہے سبب یہ کہ اس ''گھر'' کی شناخت اور پہچان جمعیتِ آدم پر ایمان ہے۔ لہٰذا کوئی صاحب ہوش کسی طرح خود کو یہ بات ماننے پر آمادہ نہیں کر سکتا کہ اقبال صرف مسلمانوں کے ترجمان تھے۔ جو وجودِ حضرت انساں نہ روح ہے نہ بدن، کے فلسفہ کا داعی تھا، حضرتِ انساں کو خانوں میں بانٹ نہیں سکتا تھا۔ کچھ مسائل پر اُن کا ردِ عمل یا کچھ دوسری مجبوریوں کا وقتی اُبال، اُن کے مستقل نظریات اور تفکر پر حاوی کرنا، صریح زیادتی ہے، جو اس بات پر یقین رکھتے تھے کہ۔

اگر ہو عشق تو ہے کفر بھی مسلمانی   نہیں تو مردِ مسلماں بھی کافر و زندیق
خرد نے کہہ بھی دیا لاالہ تو کیا حاصل   دل و نگاہ مسلماں نہیں تو کچھ بھی نہیں

وہ اقبال آفاقی کے سوا کچھ ہو نہیں سکتے تھے۔ وہ فلسفہ اسلامی کے ترجمان تھے اسی لئے جمعیتِ آدم کے حدی خوان تھے کیونکہ اسلام بنی نوع انسان کی جمعیت ہی کا دوسرا نام ہے۔

جہاں تک اقبال کے ''شاعر مشرق'' ہونے کا تعلق ہے، لگتا ہے یہ لقب انہیں انہی کے اس شعر سے ملا:

تہذیب نوی کار گہہ شیشہ گراں ہے
آداب جنوں شاعرِ مشرق کو سکھا دو

(فرمانِ خدا۔ فرشتوں سے)

یہ نظم کسی ایک فرقے سے خطاب کا معاملہ اور ماجرا نہیں اس نظم کے

مطابق تہذیب نوی کار گہہ شیشہ گراں ہے۔اس کی اصلیت اور بے اساس ہونے کی حقیقت کو صرف شاعر مشرق' واشگاف کر سکتا ہے۔یعنی مغربی تہذیب کو مشرقی آداب سے شکست کرنے کا عمل مشرق کا شاعر (اقبال) ہی انجام دے سکتا ہے۔ مغربی تہذیب کیسے مشرقی آئینے میں اپنے ناپسندیدہ خدّوخال دیکھ سکتی ہے جب تک کہ اسے کوئی یہ مشرقی آئینہ نہ دکھلائے۔لہٰذا منطقی لحاظ سے یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچتی ہے کہ شاعر مشرق کا تھا مگر اس کا پیام مشرق و مغرب سے متعلق تھا۔یہی صورت اقبال کے باقی کلام سے بھی ہویدا ہے۔وہ حکیم الامت بھی تھے' شاعر مشرق بھی تھے مگر بنی نوع انسان کے۔

●●●

بارگاہِ عشق رسولؐ میں

رسول کریمؐ کی ذاتِ والا صفات کے ساتھ اقبال کے عشق کے ابعاد متعین کرنا ایک دشوار عمل ہے۔ جو شخص اللہ سے یہ عرض کرے کہ:

؎ تو غنی از ہر دو عالم من فقیر
روز محشر عذرہائے من پذیر
ور حسابم را تو بینی ناگزیر
از نگاہِ مصطفیؐ پنہاں بگیر

جو شخص اس بات کا ایمان رکھتا ہو

؎ بہ مصطفیؐ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر بہ او نہ رسیدی تمام بولہبی است

جو شخص ''از خدا محبوب تر گردد نبیؐ'' کا نعرہ مستانہ لگا گیا' نبیؐ کے ساتھ اُس کے عشق کی سرحدوں کو کیسے دریافت کیا جا سکے گا؟ اقبال کا کلام پڑھتے ہوئے کبھی کبھی ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے انہوں نے بہت سارے شعر حضورؐ کی بارگاہ میں نذرانے کے طور پر پیش کرنے کیلئے کہے ہیں۔ اُن اشعار کے لفظ و معانی میں خوشبوئے محمدیؐ کا رچاؤ محسوس ہوتا ہے۔

خاکی و نوری نہاد ' بندۂ مولا صفات ہر دو جہاں سے غنی اس کا دل بے نیاز
ساتھ مرے رہ گئی ایک مری آرزو میرا نشیمن بھی تو شاخ نشیمن بھی تو

؎ سماں الفقر و فخری کا رہا شانِ امارت میں
بہ آب و رنگ و خال و خط' چہ حاجت روئے زیبا را

(خطاب بہ جوانانِ اسلام)

دل کے ہنگامے مئے مغرب نے کر ڈالے خموش پھر یہ غوغا ہے کہ لاساقی شراب خانہ ساز
(شمع اور شاعر)

عجمی خم ہے تو کیا' مے تو حجازی ہے مری
نغمہ ہندی ہے تو کیا' لے تو حجازی ہے مری
(شکوہ)

دل میں صلوٰۃ و درود' لب پہ صلوٰۃ و درود کافر ہندی ہوں میں دیکھ مرا ذوق و شوق
(مسجد قرطبہ)

ہر چند کہ یہ اشعار ایک الگ ہی تناظر میں کہے گئے اشعار ہیں' تاہم ان سے یہ احساس یقیناً ابھرتا ہے کہ ان اشعار کے مخاطب ذات گرامی رسول اللہؐ ہے۔ اس خیال کی صراحت میں کئی ایسے اشعار پیش کئے جا سکتے ہیں جو راست یا بالواسطہ طور پر اُسی 'دانائے سبل' ختم الرسل' مولائے کل' کی ذات سے وابستہ کئے یا سمجھے جا سکتے ہیں جس نے ''غبارہ راہ کو فروغ وادیٔ سینا عطا کیا'۔ اقبال کے یہاں عشق کا معاملہ صرف رحمۃ للعالمین اور ''رسولؐ للناس جمیعا'' کی ذات ہی سے سرشار نہیں بلکہ محمد بن عبداللہ کی ذات اقدس سے بھی نمو حاصل کرتا ہے۔

اقبالؒ کے تمام تذکرہ نگاروں نے یکے بعد دیگرے اِس روایت کو نقل کیا ہے کہ اقبالؒ بچپن ہی سے تلاوت قرآن شریف سے اپنی صبحوں کا اہتمام کرتے تھے۔ خدا کی اِس آخری کتاب کے ساتھ ان کی وابستگی مولوی میر حسن کے مکتب سے لے کر ان کے فوت ہونے تک قائم رہی۔ کوئی شک نہیں کہ اقبال نے جو ''شنید'' کے نہیں دید کے (گفت دینِ عامیاں گفتم شنید۔ گفت دین عارفاں گفتم کہ دید) مسلک کے طرفدار تھے' یقیناً اس ذات کو اسی کے اسوۂ حسنہ کے آئینے میں دیکھنے کی خواہش کی ہو اور اس خواہش کو بر لانے کیلئے جتن کئے ہوں۔

اسی عمل میں ان کو نئی راہ اور روشنی میسر ہوئی جس سے ان کی نظر کے زاویئے درست اور اُن کی خبر کے افق و آفاق وسیع سے وسیع تر ہوئے۔

بنی نوع انسان کی بہبودی اور اسے 'خلیفۃ اللہ فی الارض' کے منصب کے قابل بنانے کیلئے اسلام جو پیغام لے آیا' اس پیغام پر شارحِ اسلامؐ نے خود عمل کر کے دکھایا۔ مکہ کی گلیوں سے طائف کے بازار تک' احد سے لے کر بدر و حنین اور خندق تک' یتیمی سے لے کر سرفرازی تک' غار حرا سے لے کر مسجد نبویؐ تک' وطن سے لے کر ہجرت تک' خدا کے اس آخری رسولؐ نے بنی نوع انسان کی بہبودی اور بہتری کیلئے کیا کیا جور و ستم نہ سہے اور کیا کیا جتن نہ کئے۔ اس کا صرف اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ اس پیکر رحمت و کرمؐ، مہربانؐ، صدیقؐ، امینؐ، عادلؐ، مفکر اعظمؐ، بے مثال مدبرؐ، اور ایسے ہی ہزاروں صفات سے مزین و منور ذات کے ساتھ اقبالؒ کا عشق اس کی اپنی فکر' تاریخ عالم پر اس کی نظر اور ذہنی سطح پر اس کی خبر کا منطقی اور لابدی نتیجہ تھا' جس کا اظہار اس کے کلام میں جا بجا ہوا ہے۔ خود اللہ کی نظر میں اس ذات والا صفات کا کیا مرتبہ اور کیا عزت و تکریم ہے وہ قرآن کی زبان سے سنتے ہیں:

- ......"بلا شبہ اللہ اور اس کے ملائکہ نبیؐ پر درود بھیجتے ہیں (لہٰذا) اے لوگو جو ایمان لائے ہو' تم بھی ان پر درود و سلام "سلِمو اتسلیما" کے انداز میں بھیجو" (لاحزاب:۵۶)

- "......نہیں! اے محمدؐ: تمہارے رب کی قسم یہ کبھی مومن نہیں ہو سکتے جب تک کہ اپنے باہمی اختلافات میں یہ تم کو فیصلہ کرنے والا نہ مان لیں پھر جو کچھ تم فیصلہ کرو اس پر اپنے دلوں میں کوئی تنگی محسوس نہ کریں بلکہ سر تسلیم خم کر لیں" (النساء:۶۵)

● ......(اے رسولؐ) یقیناً تم سیدھے راستے کی طرف رہنمائی کرر ہے ہو (الشوریٰ:۵۲)

● ......آپؐ قرآن کے مستند شارع اور شارح ہیں (النحل ۴۴،۶۴)

● ......آپؐ کا فیصلہ تا قیامت تک بدلا نہیں جاسکتا (الاحزاب:۱۴۰)

● ......آپؐ کی سنت بھی قرآن ہی کی طرح ماخذ قانون ہے (النسا:۶۱)

● ......آپؐ تمام نوع انسانی کیلئے واجب الطاعت رہنما ہیں۔ (النسا۶۴،۶۵)

● ......آپؐ کے دیئے ہوئے فیصلے کی خلاف ورزی قابل مؤاخذہ جرم ہے۔ (الاحزاب:۳۶)

● ......آپؐ کے حکم سے سرتابی کرنا کفر اور منافقت ہے (النساء۶۱)

● ......آپؐ کی نافرمانی کرنے والا قیامت کے دن کف افسوس ملے گا۔ (الفرقان:۲۷)

● ......آپؐ کی مکمل اور غیر مشروط اطاعت کرنا (آل عمران:۱۳۳)

● ......آپؐ کا ادب واحترام لازم ہے (الفتح ۹ ، اعراف ۱۵۷)

● ......اے نبیؐ: لوگوں سے کہدو کہ "اگر تم حقیقت میں اللہ سے محبت رکھتے ہو تو میری پیروی اختیار کرو۔ اللہ تم سے محبت کریگا اور تمہاری خطاؤں سے درگزر فرمائے گا (آل عمران:۳۱)

- ......اے نبیؐ ہم نے تم کو تمام عالموں کیلئے رحمت بنا کر بھیجا (الانبیاء ۱۰۷)
- ......اے نبیؐ ہم نے تم کو تمام انسانوں کے لئے بشیر و نذیر بنا کر بھیجا ہے مگر اکثر لوگ جانتے نہیں (سبا:۲۸)
- ......اے محمدؐ کہو کہ اے انسانو! میں تم سب کی طرف خدا کا رسول ہوں (الاعراف:۱۵۸)
- ......بے شک تم اخلاق کے بڑے مرتبے پر ہو (نسا:۴)
- ......جو کچھ رسول تمہیں دیں وہ لو اور جس چیز سے وہ تم کو روک دیں اس سے رک جاؤ (الحشر:۷)
- ......یٰسین: قسم ہے قرآنِ حکیم کی کہ آپ رسولوں میں سے ہیں صراطِ مستقیم پر (یٰسین ۱:۴)

خود اِس ذاتِ گرامی قدر کا اپنا مسلک کیا تھا' ملاحظہ ہو:

- عرفان میرا سرمایہ ہے
- محبت میری بنیاد ہے
- شوق میری سواری ہے
- عقل میرے دین کی اصل ہے
- ذکر الٰہی میرا مونس ہے
- اعتماد میرا خزانہ ہے
- حزن میرا رفیق ہے
- علم میرا ہتھیار ہے
- صبر میرا لباس ہے
- خدا کی رضا میری غنیمت ہے
- عجز میرا فخر ہے
- زہد میرا پیشہ ہے
- یقین میری قوت ہے
- صدق میرا شفیع ہے
- طاعت (خدا کی) میرا بچاؤ
- فقر میرا فخر ہے

یہ ہیں عشقِ رسولؐ کے وہ سرچشمے جن سے اقبال سیراب و شاداب تھے۔ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ جو شخص قرآن وحدیث کے اِس مکتب میں بیٹھا' صاحب مکتب سے اس کے عشق کی سطح کا فراز کیا ہوگا۔ بالخصوص اس صورت میں کہ اس

مکتب میں بیٹھنے کے عادات اسے میر حسن جیسے نابغہ روزگار قسم کے استاد اور عالم و فاضل نے سکھائے ہوں۔ وہ کس حد تک ذات اقدسؐ سے متاثر تھے کہ قہر و مہر کے باب میں محمدؐ کے اسوہ سے ہی ایک واقعہ کے حوالے سے مولانا غلام قادر گرامی کو ۱۲/اکتوبر کے ایک خط میں لکھا:

''شاید نضیر نام کا ایک شخص تھا جو ہجرت سے پہلے حضورؐ علیہ صلوٰۃ والسلام کو سخت ایذا دیتا تھا۔ فتح مکہ کے بعد جب حضورؐ شہر میں داخل ہوئے تو ایک مجمع میں آپؐ نے علی مرتضیٰؓ کو حکم دیا کہ اس کی (نضیر کی) گردن اڑا دو۔ ذوالفقار حیدری نے ایک آن میں اس کمبخت کا خاتمہ کر دیا۔ نضیر کی بیٹی نے جب باپ کے قتل کی خبر سنی تو نوحہ و فریاد کرتی ہوئی اور باپ کی جدائی میں درد انگیز اشعار پڑھتی ہوئی دربار نبویؐ میں حاضر ہوئی۔ اللہ اکبر: اشعار سنے تو حضورؐ اس قدر متاثر ہوئے کہ اس لڑکی کے ساتھ مل کر رونے لگے یہاں تک کہ جوش ہمدردی نے اُس سب سے زیادہ ضبط کرنے والے انسان کے سینے سے آہ نکلوا کر چھوڑی۔ پھر نضیر کی لاش کی طرف اشارہ کر کے فرمایا ''یہ فعل محمد رسول اللہؐ کا نہیں اور اپنی روتی ہوئی آنکھ پر انگلی رکھ کر کہا ''یہ فعل محمد بن عبداللہ کا ہے پھر حکم دیا کہ نضیر کے بعد کوئی شخص مکہ میں قتل نہ کیا جائے۔

جب ہم علامہ کے ایسے اشعار پڑھتے ہیں:

؎ قہاری و جباری و قدوسی و جبروت
یہ چار عناصر ہوں تو بنتا ہے مسلمان
جس سے جگر لالہ میں ٹھنڈک ہو وہ شبنم
دریاؤں کے دِل جس سے دہل جائیں وہ طوفان

ہو حلقۂ یاراں تو بریشم کی طرح نرم
رزم حق و باطل ہو تو فولاد ہے مومن

تو خیال کن کی طرف جاتا ہے۔ نضیر، رزم حق و باطل میں، باطل پرستی کی علامت تھا اسلئے وہ اپنے انجام کو پہنچا، جو فلسفہ قہر و مہر کے حوالے سے انسانی معاشرے کو ابن الوقتی اور بد اخلاقی سے پاک رکھنے کی سمت میں ایک ناگزیر قدم تھا۔

علامہ کو رسول اللہؐ کی ذات سے اتنی محبت اور عقیدت تھی کہ حضورؐ کی زندگی کا کوئی واقعہ اُنہیں سنایا جاتا تو وہ رو پڑتے تھے۔ (شاید) سید عبداللہ نے کہیں لکھا ہے کہ ایک دن اقبال کو کسی نے یہ واقعہ سنایا کہ مسجد نبویؐ میں ایک بلی نے بچے جنے تھے۔ کچھ صحابۂ کرام بلی کو وہاں سے بھگانے کیلئے اس کے پیچھے دوڑ رہے تھے کہ اسی اثناء میں رسول اللہؐ مسجد میں نکل آئے اور صحابہؓ کے پیچھے گرتے پڑتے دوڑے اور بلند آواز سے پکارتے رہے "اسے مت مارو یہ تو ماں بن گئی ہے"۔ اقبالؒ مسلسل رَٹ لگا کر پوچھتے رہے کیا فرمایا میرے آقا نے 'یہ تو ماں بن گئی ہے' یہ کہتے جاتے تھے اور روتے جاتے تھے۔ اقبال کے اس واقعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ انہیں اپنے آقا سے کتنی عقیدت تھی۔ مزید انہیں تاریخ عالم پر نظر تو تھی ہی اور جانتے تھے کہ اسلام سے پہلے تصویر کائنات کے رنگوں کے ضامن اور زندگی کے سوز دروں کے ساز کے حامل اس وجود کا رتبہ کتنا حقیر تھا۔ اسی وجود کے بارے میں حجتہ الوداع کے موقعہ پر اس ہادی برحقؐ نے عورتوں کے بارے میں الگ سے وصیت کی۔ ماں کے قدموں کے نیچے جنت ہونے کی بشارت سنا کر انہوں نے عورت کا رتبہ کہاں سے کہاں پہنچا دیا۔ عورتوں کو قواریر (شیشہ) قرار دے کر ان کے ساتھ نرم روی سے کام لینے کی تاکید کی تاکہ شیشہ ٹوٹ نہ جائے، عورتوں کو میراث اور ملک میں

حصہ دار بنا دیا، جس کا تصور مہذب دُنیا کو ابھی نصف صدی پہلے تک بھی نہیں تھا۔ اقبالؒ اس محسن اعظم سے کیسے عشق نہ کرتے۔ اسی لئے حضرت بلالؓ سے اس معاملہ میں رشک کرتے تھے:

چمک اٹھا جو ستارہ ترے مقدر کا حبش سے تجھ کو اٹھا کر حجاز میں لایا
ہوئی اسی سے ترے غم کدے کی آبادی تری غلامی کے صدقے ہزار آزادی
وہ آستاں نہ چھٹا تجھ سے ایک دم کیلئے کسی کے شوق میں تو نے مزے ستم کے لئے

(یہاں 'شوق' کے معنی 'عشق' ہی ہیں)

اس رشک کے ساتھ اقبال کی اپنی تڑپ دیکھئے:

ادائے دید سراپا نیاز تھی تیری کسیؐ کو دیکھتے رہنا نماز تھی تری
اذاں ازل سے ترے عشق کا ترانہ بنی نماز اُسؐ کے نظارے کا ایک بہانہ بنی

خوشا! وہ وقت! کہ یثرب مقام تھا اسؐ کا
خوشا وہ دور کہ دیدار عام تھا اسؐ کا

لفظ 'خوشا' میں آرزوؤں اور خوابوں کی کتنی تہیں ہیں، سوچتے ہی بنتی ہے۔ اقبال بداہتہً کہتے ہیں کہ کاش وہ بھی اسی دور میں زندہ ہوتے وہ بھی محمدؐ کی غلامی کرتے انؐ کے دیدار عام سے روح کو سرسبز و شاداب کرتے اور جس ذاتؐ کے عشق کا یہ اعجاز ہے کہ رومی فنا ہوا، حبشی کو دوام ہے، اس کی چاکری میں اپنی زندگی صَرف کرتے۔

زندگی بھر علامہ روضہ رسولؐ کی زیارت کیلئے تڑپتے رہے۔ اس درویش خدمت کے پاس شاید اتنے پیسے نہ رہے ہوں کہ زادِ راہ کی کفالت ہو سکتی۔ اُن کی مالی حالت ۱۹۳۶ء میں بھی خستہ ہی تھی۔ شاید گھر کا اجلا خرچ کسی طرح فراہم ہوتا ہوگا اسی لئے بھوپال سے پانچ سو روپے کا وظیفہ منظور کیا۔

اقبال کے دِل میں روضہ رسولؐ کی زیارت کی خواہش ۱۹۱۱ء سے پہلے بھی تھی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب یورپ کے سفر سے لوٹے ہوئے انہیں دو تین برس ہی ہو گئے تھے۔ عام طور سے لوگ مغربی ممالک سے 'نئی نظر' نئی خبر' نیا ذہن اور "دین بزرگاں خوش نکرد" والی ادا اور صدا لے کر لوٹتے ہیں مگر اقبالؒ وہاں سے روضۂ رسولؐ کی زیارت کا شوق لے کر لوٹے۔ چنانچہ ۱۹۱۱ء میں اکبر الہ آبادی کو ایک خط میں لکھا:

"خدا آپ کو اور مجھ کو بھی زیارتِ روضۂ رسولؐ نصیب کرے
مدت سے یہ آرزو دل میں پرورش پا رہی ہے دیکھئے کب جوان ہوتی ہے"

مرنے سے ایک سال پہلے بھی انہوں نے سر راس مسعود کو اپنے ۱۵ر جنوری ۱۹۳۷ء کے خط میں لکھا:

"امسال دربارِ حضورؐ میں حاضری کا قصد تھا مگر بعض موانع پیش آ گئے۔ انشاء اللہ امید ہے کہ اگلے سال حج بھی کروں گا اور دربارِ رسالتؐ میں حاضر بھی دونگا"

اقبال کو ۱۹۳۱ء کے آس پاس ایک موقعہ ملا تھا کہ وہ مکہ اور مدینہ کی زیارت کر سکتے تھے۔ یہ موقعہ تھا جب وہ گول میز کانفرنس کے خرچ پر لندن سے یروشلم گئے۔ اس موقعہ سے انہوں نے فائدہ کیوں نہ اٹھایا اس کی وجہ وہ یہ بتاتے ہیں:

"مدینۃ النبیؐ کی زیارت کا قصد تھا مگر میرے دل میں یہ خیال جاگزیں ہو گیا کہ دُنیوی مقاصد کے سفر کی ضمن میں حرم نبیؐ کی زیارت کی جرأت کرنا سوءِ ادب ہے۔ اس کے علاوہ بعض مقامی احباب سے وعدہ تھا کہ جب حرم نبیؐ کی زیارت کیلئے جاؤں گا تو وہ میرے ہم عناں ہوں گے۔ اِن دو خیالوں نے مجھے باز رکھا ورنہ کچھ مشکل امر نہ تھا"

(خط بنام مولوی محمد صاحب ۶ر فروری ۱۹۳۲ء)

کچھ حضرات یہ اعتراض وارد کرتے ہیں کہ اقبالؒ اگر جاوید منزل کی تعمیر پر روپیہ خرچ کر سکتے تھے تو اپنی دیرینہ خواہش کو پورا کرنے کیلئے، زادراہ کیوں فراہم نہ کر سکے۔ وہ تاہم اس بات پر توجہ نہیں کرتے کہ جاوید منزل کی تعمیر کے سلسلہ میں کیا عجب دوستوں اور مداحوں نے اپنا فرض ادا کیا ہو۔ اقبال روپیہ زیارت روضۂ رسولؐ کے سفر میں کیسے خرچ کر سکتے تھے جب کہ گول میز کانفرنس کے خرچہ پر وہ یہ سفر کرنے کو اپنے آقاؐ کے باب میں سوادب سمجھتے تھے۔ مزید واقعہ یہ بھی ہے کہ اقبال سیالکوٹ سے نکلنے کے بعد ۱۹۳۲ء تک کرائے کے مکانوں میں رہے۔ یہ بالکل فطری لگتا ہے کہ انہوں نے بھی اپنا مکان تعمیر کرنے کی خواہش کی ہو اور اس ضمن میں اپنے بیوی بچوں کے حقوق کا بھی انہیں خیال رہا ہو۔ مکان بنانا نہ کوئی غیر اسلامی فعل تھا اور نہ غیر اخلاقی فعل بلکہ اس لحاظ سے کہ خود حضورؐ کی نظر میں ''مسلم ہے اپنے خویش و اقارب کا حق گزار'' صریحاً ایک اخلاقی فعل تھا۔ حضورؐ کی ذات سے عشق و عقیدت کا یہ فراز بھی علامہ ہی کے کلام میں ملتا ہے:

پایا نہ خضر نے مئے عمر دراز میں | تلخابہ اجل میں جو عاشق کو مل گیا
میں موت ڈھونڈتا ہوں زمینِ حجاز میں | اوروں کو دیں حضور یہ پیغام زندگی

(شفاخانہ حجاز)

زمینِ حجاز اس لئے کہ وہ آقائے نامدارؐ کی سرزمین اور مسکن ہے۔

کلامِ اقبال کے بالاستیعاب مطالعے سے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ یہ کلام ابتدائی دور کا ہو، درمیانی دور کا یا آخری دور کا غرض کسی بھی دور کا ہو اس کی تہہ میں محمدؐ کی ذات کے ساتھ کمٹمنٹ کا جذبہ رواں دواں ہے اور انہیؐ کا نظریہ حیات اقبال کو راہ اور روشنی فراہم کر رہا ہے۔ شکوہ میں اقبال نے مسلمانوں کے اَدبار اور زبوں حالی کا مقدمہ پیش کیا تو جواب شکوہ میں میں خود ایسے سوالات اور

جوابات فراہم کیے جو محمدؐ کی ذات کے ساتھ اُن کی کمٹمنٹ کے عکاس ہیں:

؎ کون ہے تارکِ آئینِ رسولؐ مختار

؎ قلب میں سوز نہیں روح میں احساس نہیں کچھ بھی پیغام محمدؐ کا تمہیں پاس نہیں

؎ کی محمدؐ سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں یہ جہاں چیز ہے کیا لوح و قلم تیرے ہیں

مطلب یہ کہ مسلمانوں کے ادبار کی وجہ رسول اللہؐ کے ساتھ کماحقہ' کمٹمنٹ نہ ہونے کا ماجرا ہے۔ مزید یہ کہ قول و فعل میں اسی ذاتِ اقدسؐ کی جانب رجوع لوح و قلم' پر تصرف کے دروازے وا کر سکتا ہے۔ سورۂ مزمل میں اللہ نے واضح الفاظ میں فرمایا ہے اللہ کے رسول کی نافرمانی میں فرعون اور آلِ فرعون صفحۂ ہستی سے مٹا دیئے گئے اسی طرح خدا کے محبوب ترین اور آخری رسولؐ اور نبیؐ کی نافرمانی مختلف انجام کو انگیخت نہیں کر سکتی۔ اسی لئے جوابِ شکوہ میں کہا گیا ؎

قوتِ عشق سے ہر پست کو بالا کر دے

دہر میں اسمِ محمدؐ سے اجالا کر دے

مسلمانوں کے آشوب و نشیب نوازی کے علاج کیلئے اقبالؒ کس رقت اور کس امید سے محمدؐ سے التجا کرتے ہیں:

اس راز کو اب فاش کر اے روحِ محمدؐ

آیاتِ الٰہی کا نگہبان کدھر جائے

(اے روحِ محمدؐ)

اسی عشق کا غماز اور عکاس یہ شعر بھی ہے:

؎ دیں مسلکِ زندگی کی تقویم دیں سرِّ محمدؐ و براہیم

دل در سخنِ محمدیؐ بند اے پورِ علی ز بو علی چند

مقصد چونکہ صرف یہ بتانا ہے کہ اقبالؒ کو رسول اللہؐ کی ذات سے والہانہ

عشق تھا' جو ان کے فکر اور ان کی سوچ میں رچا بسا تھا اور رگوں میں خون کے مثل دوڑ رہا تھا لہٰذا کلام اقبال سے اِس خیال کی تصدیق میں مزید اشعار پیش کرنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ اگر اس اجمالی تذکرے سے قارئین کا شوق مہمیز ہو اور وہ کلامِ اقبال کو اس تذکرے کے تناظر میں پڑھیں تو سمجھا جائے گا کہ سعی مشکور ہو گئی۔

●●●

سطح بینی وجہ خلط مبحث

اکثر غیر مسلم علامہ اقبال کے کلام میں کافر، مومن اور شاہین، ان تین لفظوں سے بدکتے ہیں۔ وہ کافر کو صرف ہندو اور مومن کو تمام غیر مسلموں کے خلاف برسرِ پیکار رہنے والا شخص سمجھتے ہیں۔ کچھ مسلمان بھی ان دو لفظوں کے یہی معنی لیتے ہیں۔ شاہین کو خونخواری اور کشت و خون کی علامت سمجھا جاتا ہے۔ لگتا ہے کہ انہی تین الفاظ کے استعمال کے سبب مسلمانوں نے اقبال کو حکیم الامت بنایا اور غیر مسلموں نے اس کشادہ نظر اور وسیع القلب مفکر شاعر پر تنگ نظر اور متعصب ہونے کا لیبل لگایا۔ کچھ لوگ تو یہاں تک کہتے ہیں کہ تعصب اور جنگجویانہ مزاج کی تعمیر و ترویج کے نقیب اقبال تھے۔ حقیقت البتہ یہ ہے کہ اقبال کے ذہن میں یہ الفاظ استعاراتی درجہ رکھتے تھے اور ان الفاظ کے معانی لغات سے بالکل مختلف تھے جن کا تعلق کسی مخصوص فرقے سے نہیں۔

''کافر'' عربی زبان کا لفظ ہے اور قرآن مجید میں اس لفظ کا بار بار استعمال ہوا ہے۔ ان تمام آیات کریمہ کے سیاق و سباق میں، جن میں یہ لفظ وارد ہوا ہے اس کے یہ معنی نکلتے ہیں:

(۱) ناشکری کرنے والا

(۲) نہ ماننے والا، انکار کرنے والا، رد کرنے والا۔

ان دو خصائص کی صورتیں قرآن کی نظر میں مختلف ہیں جیسے:

(۱) انسان سرے سے ہی خدا کو نہ مانے یا اس کے اقتدارِ اعلیٰ کو تسلیم نہ کرے اس کو اپنا اور کائنات کا واحد مالک و معبود ماننے سے انکار کرے۔

(۲) اللہ کو تو مانے مگر اس کے احکام اور اس کی ہدایات کی تعمیل سے انکار کرے

(۳) خدا کے پیغمبروں کو تسلیم نہ کرے

(۴) خدا کے پیغمبروں میں سے بعض کو مانے اور بعض کو نہ مانے

(۵) پیغمبروں کی تعلیمات پر عمل نہ کرے نہ انہیں مانے

(۶) احکام الٰہی کی دانستہ، قولاً و فعلاً، نافرمانی کرے

(۷) اپنی زندگی کو قانون الٰہی کی اطاعت کے بجائے دوسروں کی اطاعت کیلئے وقف کرے۔

قرآن حکیم سے یہ ثابت نہیں کیا جاسکتا کہ یہ لفظ مخصوص طور پر ہندوؤں یا کسی اور مخصوص فرقے سے مختص ہے۔ ہماری نظر میں یہ لفظ ہر اس فرد، قوم یا جماعت کا احاطہ کرتا ہے جو متذکرہ منفی افعال کا مرتکب ہو اقدار عالیہ سے منہ موڑنا، ان کی محافظت سے صرف نظر کرنا، مسکینوں کو کھانا نہ کھلانا، یتیموں کی پرورش نہ کرنا، امانت میں خیانت کرنا یہ بھی کفر کی علامات ہو سکتی ہیں۔ اقبالؒ یقیناً اس لفظ کی اساس سے واقف رہے ہوں گے، کیونکہ وہ عربی زبان سے واقف تھے اور اتنا واقف کہ کیمبرج یونیورسٹی میں عربی کے استاد بھی رہے۔ اسی لئے انہوں نے ذمہ داری کے ساتھ کہا۔

اگر ہو عشق تو ہے کفر بھی مسلمانی نہ ہو تو مرد مسلماں بھی کافر و زندیق

کافر ہندی ہوں میں دیکھ مرا ذوق و شوق دل میں صلواۃ و درود لب پہ صلواۃ و درود

دوسرا لفظ مومن کا ہے۔ یہ لفظ بھی عربی ہے اور اس کا معنی ہے 'ایمان لانے والا' ایمان کس پر قرآن اس کا جواب دیتا ہے اللہ پر، اس کے ملائکہ پر، اس کی کتابوں پر اللہ کے رسولوں پر، اس عہد کے ساتھ کہ ان میں کوئی فرق نہیں کیا جائے

گا' اور روز آخر پر"۔ اس لحاظ سے مومن بین الملی اور بین الاقوامی سطح پر صلح کل اور امن واشتی کی علامت ٹھہرتا ہے۔ واقعہ بھی یہی ہے کہ مومن کوئی ایسا کام نہیں کر سکتا یا کسی ایسے کام میں اعانت نہیں کر سکتا' جس کا نتیجہ اس زمین پر فساد کی صورت میں نکلے۔ قرآن اسے ہدایت دیتا ہے کہ اب کہ اصلاح کا کام (خاتم النبیینؐ کے ہاتھوں) مکمل ہو چکا اب اس زمین پر فساد بپا نہ کرو (لا تفسدو فی الارض بعد اصلاحها)۔ عام طور سے سمجھا جاتا ہے کہ مومن وہ ہے جو دین کی اشاعت کیلئے شمشیر بدست ہو اور تیغ و تفنگ لئے پھرتا ہو۔ حقیقت البتہ یہ ہے کہ اسلام دین کے معاملہ میں کسی جبر یا زور کا قائل ہی نہیں بلکہ کھلے الفاظ میں اس رویہ سے باز رہنے کی تلقین کرتا ہے۔ اسلام کے نزدیک ہر انسان کو پوری آزادی حاصل ہے وہ اپنی انفرادی اور ذاتی حیثیت میں کوئی بھی عقیدہ اور دین اختیار کرے۔ اس کی صراحت قرآن کی کئی آیتوں میں موجود ہے۔ مثلاً

● ......"دین کے معاملہ میں کوئی زور جبر نہیں (ترجمہ سورۃ البقرہ: آیت ۲۵۶)

● ......صاف کہہ دو یہ حق ہے تمہارے رب کی طرف سے اب جس کا جی چاہے مان لے اور جس کا جی چاہے انکار کر دے (ترجمہ: آیت ۲۹ سورہ الکہف)

● ......اچھا (اے نبیؐ) نصیحت کئے جاؤ۔ تم نصیحت ہی کرنیوالے ہو۔ کچھ ان پر جبر کرنیوالے نہیں (ترجمہ: آیت سورہ الغاشیہ ۲۲)

● ......اے نبیؐ! تاہم اگر لوگوں کی بے رخی آپ سے برداشت نہیں ہوتی تو اگر آپ میں زور ہے تو زمین میں سرنگ لگاؤ یا آسمان میں سیڑھی اور ان کے پاس نشانی (معجزہ) لانے کی سعی کرو۔ اگر

اللہ چاہتا تو ان سب کو ہدایت پر جمع کر سکتا تھا۔ لہٰذا نادان مت بنو۔ دعوت حق پر وہی لوگ لبیک کہتے ہیں جو سننے والے ہیں۔ رہے مردے تو انہیں اللہ بس قبروں سے اٹھائے گا پھر وہ اس کی عدالت میں پیش ہونے کیلئے واپس لائے جائیں گے۔ (ترجمہ آیت ۳۶:۳۴ سورہ الانعام)

● ......اور اگر مشرکین میں سے کوئی شخص پناہ مانگ کر تمہارے پاس آنا چاہے تو اسے پناہ دو یہاں تک کہ وہ اللہ کا کلام سن لے۔ پھر اسے اس کے مامن تک پہنچا دو۔ یہ اس لئے کرنا چاہئے کہ یہ لوگ علم نہیں رکھتے (تاکہ اسلام کو جبر کے بجائے شعوری طور پر سمجھنے کے بعد دل سے قبول کریں) (ترجمہ آیت ۶ سورہ التوبہ)

لہٰذا مومن دین کی اشاعت کیلئے تلوار اٹھا ہی نہیں سکتا۔ شارح قرآنؐ نے فرمایا "الناس کاسنان المشط" "لوگ کنگھی کے دندانوں کی طرح ہیں۔ مزید فرمایا کہ وہی اچھا ہے جو اخلاق کے باب میں اچھا ہو۔ لوگوں کو کنگھی کے دندانوں کی طرح ایک دوسرے سے مربوط اور اخلاق کو اولیٰ سمجھنے والا ہی وہ مومن ہو سکتا ہے، جو اپنی ایک نگاہ سے تقدیریں بدلنے پر قادر ہوتا ہے:

؎ کوئی اندازہ کر سکتا ہے اس کے زورِ بازو کا
نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں

یہی مومن:

؎ ہو حلقۂ یاراں تو بریشم کی طرح نرم
رزم حق و باطل ہو تو فولاد ہے مومن

اسی مومن کی افلاک سے حریفانہ کشاکش ہے تاکہ انہیں اپنے زیر قدم لا سکے۔ وہ خاکی ہونے کے باوصف خاک سے بندھا ہوا یعنی اس زمین اور اس کی

ترغیبات کے حدود میں قید نہیں۔ یہی مومن جبریل وسرافیل کی (فی نفسہٖ نہیں، صفاتی طور پر) بلندیوں کو چھونے کا حوصلہ رکھتا ہے۔

افلاک سے ہے اسکی حریفانہ کشاکش　　خاکی ہے مگر خاک سے آزاد ہے مومن

جچتے نہیں کنجشک و حمام اس کی نظر میں　　جبریل و سرافیل کا صیاد ہے مومن

اقبال کی نظر میں تمام عالم اسی مومن جانباز کی میراث ہیں۔ وہ جو صاحب لولاک نہیں، وہ مومن نہیں

عالم ہے فقط مومن جانباز کی میراث　　مومن نہیں جو صاحب لولاک نہیں ہے

اس صراحت کے بعد بھی اگر کچھ لوگ اسی پر مصر رہیں کہ اقبال کا مومن حضورؐ کے حوالے سے آفاقی نہیں بلکہ صرف اچھے برے ہر قسم کے مسلمان سے وابستہ مومن ہے تو ایں چہ بوالعجبی است کے سوا کیا کہا جائے۔

تیسرا قابل اعتراض لفظ 'شاہین' ہے۔ شاہین ایک پرندہ ہے جو اسی فضائے بسیط میں، جس میں بلبل سے لے کر گرگس تک سبھی پرندے اڑتے رہتے ہیں، اڑتا ہے۔ اس پرندے کی صفت یہ ہے کہ یہ سخت کوش ہے، پہاڑوں کی چٹانوں میں گزر بسر کرتا ہے اور صرف بلندیوں کی جانب اڑان بھرتا ہے۔ یہ پرندہ جن بلندیوں اور دوریوں کو سر کرتا ہے ان کی جانب دوسرے پرندے آنکھ اٹھا کر دیکھنے کی ہمت نہیں کرتے۔ شاہین (باز یا عقاب) کا حوصلہ، اس کی ہمت، نظر کا فراز اس کو اونچے سے اونچے مقام کو زیر قدم لانے کی تحریک و تشویق فراہم کرتے ہیں ورنہ

پرواز ہے دونوں کی اسی ایک فضا میں
کرگس کا جہاں اور ہے اور شاہین کا جہاں اور

اس لحاظ سے اقبال نے ''شاہین'' کو ایک ایسے انسان جماعت یا قوم کی علامت بنایا جو سنجاب و کمخواب کے بستروں پر لیٹے لیٹے خواب بننے کے اسیر نہ

ہوں۔ جو دنیا کے مادی بندھنوں میں جکڑے ہوئے فعالیت اور تحرک کے جذبوں سے عاری نہ ہو گئے ہوں۔ جو ایک اعلیٰ مقام حاصل کرنے کیلئے ہمت اور حوصلہ جتا سکتے ہوں۔ جو گلزار ہستی میں آبرو حاصل کرنے کیلئے اپنے اندر کانٹوں سے الجھنے کی خو پیدا کرنے کی سکت رکھتے ہوں۔ اس شاہین کو کس قبیلے' کس ملک اور کس قوم کے ساتھ مختص کر کے رکھا جا سکتا ہے' یہ ایک سوال ہے اور اس سوال کے اندر ہی اس کا جواب پوشیدہ ہے۔ اسی شاہین کے حوالے سے یہ پیغام کہ ۔

شاہین کبھی پرواز سے تھک کر نہیں گرتا
پُردم ہے اگر تو تو نہیں خطرۂ افتاد

کس کیلئے ہے' سوچئے
اقبال جب کہتے ہیں ۔

زاغ کہتا ہے نہایت بدنما ہیں تیرے پر
شپرک کہتی ہے تجھ کو کور چشم و بے ہنر
لیکن اے شہباز یہ مرغان صحرا کے اچھوت
ہیں فضائے نیلگوں کے پیچ و خم سے بے خبر
ان کو کیا معلوم اس طائر کے احوال و مقام
روح ہے جس کی دم پرواز سرتا پا نظر

روح کا سرتاپا نظر ہونا ایک بے حد خوبصورت اور بلند تخیل کا ماجرا ہی نہیں' اس کے تہہ در تہہ معانی اس بات کا احساس دلاتے ہیں کہ زندہ قوموں کی شناخت ہی یہ ہے کہ اس کے افراد کی روح سرتاپا نظر ہوتی ہے۔ جو خانقاہوں' گرجا گھروں آشرموں اور معبدوں میں فعالیت اور تحرک سے عاری اور عاجز زندگی گزارنے پر رضامند ہو گئے ہوں۔ ان کو فضائے نیلگوں کے پیچ و خم کیسے نظر آ سکتے ہیں۔ جو

قومیں شاہین کی آنکھ رکھتے ہیں شاہین جو پرواز کے عمل میں صرف اپنی منزل پر آنکھ رکھتا ہے اور باقی وجود کو بھول جاتا ہے وہی کائنات کو مسخر کر سکتی ہیں۔ اور خلیفۃ اللہ فی الارض کے منصب اعلیٰ پر بیٹھنے کا حق حاصل کر سکتی ہیں۔ جہاں تک شاہین کے خونخوار ہونے کا تعلق ہے یہ محض ایک اختراع ہے جس کے ثبوت میں اکثر یہ دو شعر پیش کیے جاتے ہیں۔

پلٹ کر جھپٹنا' جھپٹ کر پلٹنا
لہو گرم رکھنے کا ہے اک بہانہ

جو کبوتر پر جھپٹنے میں مزہ ہے اے پسر
وہ مزہ شاید کبوتر کے لہو میں بھی نہیں

یہ اشعار کسی طرح شاہین کی خونخواری کو ثابت نہیں کرتے۔ جھپٹنا فعالیت اور تحرک کی نشانی ہے اور سارے زندہ دینی یا دینوی فلسفے تحرک اور فعالیت کو زندگی کا جوہر اور آبرو قرار دیتے ہیں۔ اسلام کا سارا فلسفہ ہی فعالیت کا فلسفہ ہے۔ تاریخ گواہ ہے کہ جن قوموں یا افراد کا لہو ٹھنڈا پڑ جاتا ہے انہیں کوئی نہ کوئی ''شاہین'' قوم تسخیر کر لیتی ہے۔ اسی طرح دوسرے شعر میں بھی ''جھپٹنے'' کا درس ہے یعنی عمل کا اور شاہین بچے کو یہ بھی سمجھایا جا رہا ہے کہ منزل اور مقصد کبوتر کا لہو پینا نہیں یعنی شکم پروری نہیں بلکہ خود کو بڑے مقاصد کے حصول کیلئے وقف کرنا اور فعال رکھنا ہے۔

دل مردہ' دل نہیں اسے زندہ کر دوبارہ
کہ یہی ہے امتوں کے مرض کہن کا چارہ

دل مردہ کو زندہ کرنے کیلئے اسے متحرک اور فعال بنانا ضروری ہے اور وہ فعال بنے تو فراز کے زاویے اس کی آنکھ پر کھل جائیں گے۔ پلٹ کر جھپٹنے میں تسلسل عمل کا جو نکتہ پنہاں ہے وہ صراحت طلب نہیں۔

جو لوگ اس کے باوصف اقبال کے شاہین کو خونخوار سمجھنے پر مصر ہیں ا
کیلئے اقبال خود ہی کہہ گئے ہیں۔

بہتر ہے بے چارے مولوں کی نظر سے
پوشیدہ رہیں باز کے احوال و مقامات

●●●

پاسبانِ خودی

خودی کی تعریف و توصیف میں ہزار ہا صفحے لکھے جا چکے ہیں۔ مختلف نظریات کے حوالے ۔سے اس جذبے کو سمجھنے کی سعی کی گئی ہے اور مختلف تفسیر و تشریحات سامنے آئی ہیں خودی کا لفظ اقبالؒ کے فکری نظام کی کلید ہے اور ایک علامت کا درجہ رکھتا ہے۔ اقبال کے یہاں خودی وسیع الابعاد ہے۔

خودی تکبر، غرور، خودنمائی، خود پرستی جیسے اوصاف قبیحہ کے ہم معنی نہیں۔ خودی انسان کے اپنے آپ کو Realize کرنے یعنی اپنے وجود کے اصلی قد سے آشنا ہونے اور اس قد کو بلند تر کرنے کا (حتی ایں کہ وہ قطرہ ہو تو سمندر آشنا ہو جائے یا خود سمندر بن جائے) معاملہ اور ماجرا ہے۔ خودی ''لقد خلقنا الانسان فی احسن تقویم '' کو برحق ثابت کرنے کے راستے کی روشنی کا نام ہے۔ خودی خدا کائنات اور انسان کے درمیان، انسان کے درجہ کا تعین کرنے کی سعی اور اس سعی کے معیار اور مقدار کی داستان ہے۔ خودی، خودنگری اور خود شناسی کے ذریعہ خداشناسی کے سفر کی کہانی ہے۔ لیکن جہاں یہ تکبر اور غرور کا رنگ پکڑ لیتی ہے وہیں یہ ابلیسی صفت بن جاتی ہے۔

اس بات پر بحث کی کوئی گنجائش نہیں کہ مشیت ایزدی میں انسان کو اس دنیا میں محض ماہ و سال گزارنے کیلئے اور جان و تن کا رشتہ قائم رکھنے کیلئے غذائی احتیاج کی فراہمی کو یقینی بنانے کیلئے نہیں بھیجا گیا ہے۔ انسان کو اسکے تمام عیوب کے باوصف اس زمین پر خلیفۃ اللہ بنا کر بھیج دیا گیا۔ ظاہر ہے کہ اس کی یہ حیثیت اختیار کلی کی نہ سہی مگر بہت حد تک با اختیار ہونے کی ہے۔ اس اختیار کے حدود مقرر

کرنا اور ان کے اندر رہتے ہوئے خلیفۃ اللہ کے فرائض انجام دینا' خودی کا سبق پڑھے بغیر اور اسے حرز جان و دل کئے بغیر ممکن نہیں۔ خودی' خود اعتمادی بھی ہے' ہمت بھی' حوصلہ بھی' صبر بھی' سود و زیاں سے بے گانگی اور تمام سفلی جذبات اور افعال سے دوری سے بھی عبارت ہے۔ خودی' یکجہتی جذبہ نہیں مختلف الجہت اور مختلف المعنی ہے اور بیان سے زیادہ احساس سے تعلق رکھتی ہے۔ علم سے ہوتے ہوئے عشق کی منزل تک رہنمائی اور رہبری کرنے والی طاقت ہے۔ خودی قوت ہے اور اسی قوت کے حصول اور مظاہرہ کیلئے رسول اللہ صلعم نے فرمایا کہ اپنے اندر خدائی صفات پیدا کرو یعنی قہاریٔ' غفاری و قدوسی و جبروت کے حامل بنو (تخلقو با خلاق اللہ)

خودی اس وقت تک پیدا نہیں ہو سکتی جب تک انسان آزادیٔ اظہار سے بہرہ ور نہ ہو۔ اظہار ظاہر ہے کہ صرف محدود معاملات میں ہی نہیں روا رکھا جا سکتا ہے۔ ابلیس کو بھی آزادیٔ اظہار ملی جو اس کی خودی کی علامت بنی۔ اس کی خودی نے منفی جہت پکڑ لی۔ یہ اس کی بد قسمتی تھی کہ وہ خودی کی شان نہ حاصل کر سکا اقبال یہاں تک کہتے ہیں کہ:

> "خودی خواہ مسولینی کی ہو خواہ ہٹلر کی' قانون الٰہی کی پابند ہو جائے تو مسلمان ہو جاتی ہے۔ مسولینی نے حبشہ کو محض جوع الارض کی تسکین کیلئے پامال کیا۔ مسلمانوں نے اپنے عروج کے زمانہ میں حبشہ کی آزادی کو محفوظ رکھا۔ فرق اس قدر ہے کہ پہلی صورت میں خودی کسی قانون کی پابند نہیں۔ دوسری صورت میں قانون اور اخلاق کی پابند ہے......"

اقبال کی نظر میں خودی کی حیثیت اس قطرۂ بے مایہ کی نہیں ہے جو دریا

میں جا کر فنا ہو جائے اور اپنی ہستی گم کردے بلکہ اس کی مثال اس قطرے کی ہے جو دریا میں جا کر گوہر بنے"۔ ایک اور جگہ اقبال خودی کی صراحت ان الفاظ میں کرتے ہیں:

"خودی کے مسئلے کو اس وقت تک نہیں سمجھا جا سکتا جب تک زندگی کے اس تناقض اور تضاد کو نہ سمجھا جائے کہ زندگی فطرت کا جزو بھی ہے اور اس سے ماورئی بھی ہے اور فطرت پر غلبے کی صلاحیت بھی رکھتی ہے۔ وہ پابند بھی ہے اور آزاد بھی۔ انسانی خودی کی نجات یہ نہیں کہ وہ ذاتِ باری میں فنا ہو جائے بلکہ یہ ہے کہ وہ اپنے ارادے خالق کائنات کے ارادے کے تابع کردے"

خودی کے اسی تصور کے تحت اقبالؒ نے کہا:

اس قوم کو شمشیر کی حاجت نہیں رہتی
ہو جس کے جوانوں کی خودی صورتِ فولاد

(اسرار پیدا)

یا

نہ میں عجمی نہ ہندی، نہ عراقی و حجازی
کہ خودی سے میں نے سیکھی دو جہاں سے بے نیازی

"نفس گدازی" اور "نفس شماری" کی ترکیبات کتنی خوبصورت ہیں اور کس طرح خودی کی تشریح پیش کرتی ہیں

تو مری نظر میں کافر، میں تری نظر میں کافر
ترا دیں نفس شماری، مرا دیں نفس گدازی

خودی سب خصوصیات سے الگ اور سب خصوصیات کیساتھ "نفس گدازی"

کا مرحلہ ہی ہے۔

خودی کی پرورش و تربیت پہ ہے موقوف
کہ مشت خاک میں پیدا ہو آتش ہمہ سوز
یہی ہے سر کلیمی ہر اک زمانے میں
ہوائے دشت و شعیب و شبانی شب و روز

(خودی کی تربیت)

'خودی' کا جذبہ ہر فرد میں موجود ہونا ایک فطری امر ہے۔ سارا معاملہ اور ماجرا اس جذبے کی مقدار اور سارا کام اسے فروغ دینا اور اسے صیقل کرنے کا ہے۔ علم اس جذبے کو توانا بنا سکتا ہے مگر عشق اسے ناقابل تسخیر بنا سکتا ہے۔ علم اور عشق کی اساس پر خودی استوار ہو تو بے پایاں سمندر بن جاتی ہے

۔ قوموں کیلئے موت ہے مرکز سے جدائی
ہو صاحب مرکز تو خودی کیا ہے؟ خدائی
۔ محرم خودی سے جس دم ہوا فقر
تو بھی شہنشاہ میں بھی شہنشاہ

اقبال کی نظر میں وہی امتیں رسوا ہو جاتی ہیں اور وہی ادب بے کیف اور بے معنی ہوتا ہے جو خودی کا حامل نہ ہو۔ خودی ہی امتوں کو سلطنتیں عطا کرتا ہے اور خودی سے مملو ادب ہی ذہن و جسم کی تربیت کا حق ادا کر سکتا ہے:

المختصر اقبال کے یہاں "خودی" اصل حیات اور مقصد تخلیق انساں اور فلسفۂ نیابت کی شارح ہے اسی لئے کہا۔

خودی کی موت سے مغرب کا اندروں بے نور — خودی کی موت سے مشرق ہے مبتلائے جذام
خودی کی موت سے روح عرب ہے بے تب و تاب — بدن عراق و عجم کا ہے بے عراق و عظام

خودی کی موت سے ہندی شکستہ بالوں پر قفس ہوا ہے حلال اور آشیانہ حرام
خودی کی موت سے پیر حرم ہوا مجبور کہ بیچ کھائے مسلماں کا جامۂ احرام

یا

خودی کیا ہے راز درون حیات خودی کیا ہے بیداریٔ کائنات
خودی جلوہ بدمست و خلوت پسند سمندر ہے اِک بوند پانی میں بند
اندھیرے اجالے میں ہے تابناک من وتو سے پیدا من وتو سے پاک
خودی کا نشمین ترے دل میں ہے فلک جس طرح آنکھ کے تل میں ہے

بس فلک کو آنکھ کے تل میں سمانے کی قوت خودی کی قوت ہے اور خودی کی قوت، قوتوں کے سرچشمے سے سیراب ہونے کی قوت عطا کرتی ہے۔

●●●

وسیع المشرب اقبالؒ

ہمارے اکثر دانشور اقبالؒ کو یا تو ایک کٹھ حجتی ملا کے طور پر پیش کرنے میں اپنی علمی استعداد کو بروئے کار لاتے ہیں یا پھر اُنہیں دُنیا و مافیہا سے بے خبر ایک درویش ثابت کرنے میں زورِ قلم صرف کرتے ہیں۔ کچھ ان کو تفضیلی سمجھتے تھے اور کچھ ان کو اشتراکیت کا علمبردار سمجھتے ہیں۔ کچھ انہیں وطن پرست اور کچھ انہیں وطنیت بیزار دانشور سمجھتے ہیں۔ کچھ اُنہیں کٹر مسلمان اور کچھ اُنہیں خالص فلسفہ دان سمجھتے ہیں۔ کچھ اُن کے خیالات کا تعلق ہیومنزم سے جوڑتے ہیں اور کچھ انسانیت کے وسیع تر معنوں میں اُنہیں سمجھنے کا جتن کرتے ہیں۔ سارے اُن ہی کی تحریروں سے اقتباسات پیش کرتے ہیں اور اپنے نقطۂ نظر کو درست ثابت کرنے کا جتن کرتے ہیں۔ یہ تضاد جو اقبالؒ پر لکھنے والوں کے درمیان پایا جاتا ہے، یہی اُن کے وسیع المشرب ہونے کا ایک بیّن ثبوت ہے۔

اقبالؒ اپنی تحریروں کے آئینے میں، چاہیے وہ نثری ہوں یا شعری، ایک ایسے فرد کے طور پر ابھرتے ہیں جو بنیادی طور پر انسان کی عظمت —— اس انسان کی جو وحدت کی تخلیق کردہ وحدت ہے اور جسے جغرافیائی، سیاسی، مذہبی اور مسلکی، تمدنی اور معاشرتی سطحوں پر تقسیم نہیں کیا جا سکتا —— کا حدی خوان ہے۔ اس انسان کا منشور حیات انسانیت ہے۔ یہ انسان سراپا عمل اور تحرک ہے۔ یہ ملکوتی صفات کا حامل ہے۔ خرابوں کو آباد کرنے کی ہمت رکھنے والا انسان ہے۔ یہ ہندوستان میں بھی رہتا ہے، پاکستان میں بھی، افریقہ میں بھی امریکہ میں بھی۔ مشرق میں بھی مغرب میں بھی، شمال میں بھی اور جنوب میں بھی۔ اقبالؒ اسی انسان

کی خودی میں تسخیر کائنات کے امکانات کا مشاہدہ کرتے ہیں۔ یہی انسان اُن کا شاہین ہے اور غازی ہے اپنے ایک مضمون ''قومی زندگی'' میں وہ رقم طراز ہیں:

''اگر ہم متمدن دُنیا کی گزشتہ اور موجودہ تاریخ کو دیکھیں تو معلوم ہوتا ہے کہ اقوام قدیمہ میں سے صرف چار قومیں ایسی ہیں جو قوانین زندگی کی تیز تلوار سے بچ کر بری بھلی حالت میں اب تک صفحہ ہستی پر قائم ہیں یعنی چینی، ہندو، بنی اسرائیل اور پارسی............

بنی اسرائیل کی تاریخ ایک دردناک کہانی ہے جس کو ایک درد مند دل سن بھی نہیں سکتا۔ تاہم یہ قوم اپنے فطری قویٰ کے لحاظ سے اس قدر حیرت انگیز ہے کہ کوئی مشرقی و مغربی قوم، سوائے ہندوؤں کے اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی............

...... یہودیوں کو چھوڑ کر پارسیوں کی تاریخ پر نگاہ ڈالو ایک زمانے میں عظیم الشان قوم تھی۔ یہودیوں کی طرح اس قوم میں بھی پیغمبر مبعوث ہوئے کیانی تہذیب وتمدن انتہائی نقطہ تک پہنچا آخر کار شہنشاہ یزد جرد کے عہد میں عربی تلواروں نے کیانی شائستگی کو صفحہ عالم سے معدوم کر دیا ......لیکن کیا یہ قوم صفحہ ہستی سے مٹ گئی...... اِن دونوں قوموں نے انقلاب کو کسی قدر سمجھ لیا ہے، جس کی سب سے بڑی خصوصیت صنعت وتجارت ہے......''

مسلمانوں کی حالت زار کا رونا روتے ہوئے آگے چل کر لکھتے ہیں کہ مسلمان قوم ''وقت کے تقاضوں سے غافل اور افلاس کی تیز تلوار سے مجروح ہو کر ایک بے معنی توکل کا عصا ٹیکے کھڑی ہے۔ اور باتیں تو خیر ابھی تک ان کے مذہبی نزاعوں کا ہی فیصلہ نہیں ہوا۔ آئے دن

ایک نیا فرقہ پیدا ہوتا ہے جو اپنے آپ کو جنت کا وارث سمجھ کر باقی تمام نوعِ انسان کو جہنم کا ایندھن قرار دیتا ہے"۔

اس مضمون کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ اقوام عالم کی تواریخ پر اقبال کی نظر گہری تھی۔ اسی لئے انہوں نے ہندو، بنی اسرائیل، پارسی، جاپانی قوموں کی تعریف میں کسی بخل سے کام نہیں لیا بلکہ اُن کے حوالے سے مسلمانوں کو عمل کی جانب توجہ کرنے کی تحریک دی۔ اسی کا نام وسیع المشربی ہے۔ یہ کہنا کہ اقبال کا ذہن ہندی ہے اور انہوں نے مغرب سے بھی اخذ و قبول کا رشتہ قائم رکھا مگر ان کا سرچشمہ فکر قرآن ہے، اور توحید و رسالت ان کے فکر کا جزو لاینفک ہے، ان کی وسیع المشربی کا ایک اور ثبوت ہے۔ اقبالؒ کا ہندی ذہن قرآن و حدیث کی روشنی میں آفاقی حقائق سے پردہ کشائی میں صرف ہوا۔ مسلمان اور اسلام کو اقبال نے ایک فکری، حرکی، وسعت پذیر، ہمہ رنگ اور ہمہ پہلو علامت کے طور پر استعمال کیا، جس کا براہ راست مخاطب تو مسلمان لگتا ہے مگر بین السطور مطلب انسان واحد سے ہے، جمعیت آدم سے ہے۔

اقبال کی 'وسیع المشربی' پر شکوک وارد کیے جاتے ہیں، ان کے سیاسی فکر کی بناء پر۔ اولاً اقبال عملی سیاست کے میدان میں کبھی نہیں اترے اور ثانیاً سیاست، محض وقتی تقاضوں کے پیش نظر کسی مسئلے کا حل ڈھونڈنے کا ماجرا ہے۔ سیاست میں شاذ ہی کسی فکری نظام کا اِدخال ممکن رہا ہے۔ ضرورت اِس بات کی ہے کہ مفکر اقبال کو سیاستدان اقبال سے علیحدہ سمجھا جائے۔ ان کے سیاسی عقائد ذہن سے نکال دیئے جائیں تو اقبالؒ ہر ایک کو اپنا "گائڈ اینڈ فلاسفر" نظر آئے گا۔ اور جب تعصبات کے صنم خانے توڑ دیئے جائیں گے تو حقائق پر سے پردہ اٹھ جائے گا۔

تیرے بھی صنم خانے، میرے بھی صنم خانے دونوں کے صنم خاکی، دونوں کے صنم فانی

اقبال کی شاعری سے ان کی وسیع المشربی کی سینکڑوں مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں، مگر اس اجمالی تذکرے میں ایسا کرنا ممکن نہیں۔ اس عنوان کے تحت مقصد صرف یہ بات عرض کرنے کا ہے کہ اقبالؔ کو مسلمان صرف اپنا اور ہندو صرف مسلمانوں کا شاعر و خطیب نہ سمجھیں۔

●●●

مجتہد اقبال

اقبال کے خطبات اسلام میں اجتہاد کے فلسفے کی بسیط و بلیغ تشریح پیش کرتے ہیں۔ اجتہاد کا شرعی پہلو یہ ہے کہ اگر اجتہاد صحیح مسئلے پر صحیح انداز سے کیا جائے تو اس کے دو ثواب ملتے ہیں اور اگر اجتہاد صحیح نہ ٹھہرے، جب بھی خلوص نیت کے سبب ایک ثواب کا حقدار ٹھہرے گا۔ یہ اصول قائم کر کے اسلام نے بداہتہً انسان کو غور و فکر کی جولانگاہوں پر کمند ڈالنے کی تحریک و تشویق فراہم کی، جو قرآن کے افلا یتدبرون، افلا تعقلون اور افلا یتفکرون کے حیات بخش پیغام کے عین مطابق ہے۔ تدبر، تفکر اور تعقل کی صفات ہی انسان کو حیوانات سے ممیز و ممتاز کرتی ہیں ورنہ چلنے پھرنے، کھانے، سونے وغیرہ پر حیوانات بھی قادر ہیں۔ یہ صفات "لقد خلقنا الانسان فی احسن تقویم" کا ماجرا بھی ہیں۔ اس رمز سے اقبال واقف ہونے کی طرح واقف تھے۔ اسی لئے انہوں نے اپنے خطبات کے ذریعہ عقائد اور حکمت دین کے باب میں اجتہادی رویہ اپنانے کی بات کی۔ شفاف اور میٹھے پانی کے ایک کنوئیں کے پانی کو نتھارنے کا اجتہاد اقبال کی نظر میں اہم تھا تا کہ وقت گزرنے کے ساتھ اس کنوئیں میں جو خس و خاشاک گرتا ہے، اسے دور کر کے اس کی گہرائی کی بازیافت کی جاسکے۔ مذہب میں بھی مذکورہ کنوئیں کے مثل، اس کی اصل روح اور مقصد کو واضح کرنے کیلئے وقتاً فوقتاً اجتہاد کرنا لازم بن جاتا ہے۔ مجددوں کے حوالے سے بات نہ بھی کی جائے، جب بھی اقبال جیسے صاحب خبر اور صاحب نظر ایک اجتہادی تفکر کے خدوخال واضح کرنے کی ضرورت سے آنکھیں نہیں چرا سکتے تھے۔ ان کے خطبات اور دوسری نثری کاوشیں اس بات

کا ثبوت فراہم کرتی ہیں کہ وہ اسلام میں وسیع تر تناظر میں اجتہاد کے قائل تھے۔
اسی پس منظر میں مولانا سلیمان ندوی کو ایک خط میں لکھا:

"میری مذہبی معلومات کا دائرہ نہایت محدود ہے۔ البتہ فرصت کے اوقات میں اس بات کی کوشش کیا کرتا ہوں کہ ان معلومات میں اضافہ ہو"۔

اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ اسلام کا مطالعہ کرنا ان کا عمل تھا۔

اقبال نے سب سے پہلا اجتہاد مسلمانوں کی عام بے حسی اور لاتعلقی کے خلاف کیا، جس کی ذمہ داری ان کی نظر میں ان مولویوں پر تھی جو اسلام کی اساس یعنی فعالیت اور تحرک کے فلسفے سے ناواقف تھے اور واقف ہونے کیلئے کوئی جتن نہیں کرتے تھے۔ اس دکھ کا اظہار انہوں نے اکبر الہٰ آبادی کے نام ۲۵/ اکتوبر ۱۹۲۵ء کے خط میں کیا ہے:

"یہاں لاہور میں ضروریات اسلامی سے ایک متنفس بھی آگاہ نہیں۔ یہاں انجمن اور کالج اور فکر مناصب کے سوا اور کچھ نہیں۔ پنجاب میں علماء کا ہونا بند ہو گیا ہے اور اگر اللہ تعالیٰ نے کوئی خاص مدد نہ کی تو آئندہ بیس سال نہایت خطرناک نظر آتے ہیں۔ صوفیاء کی دکانیں ہیں مگر وہاں سیرت اسلامی کی متاع نہیں بکتی۔ اب اسلامی جماعت کا محض خدا پر بھروسہ ہے۔ میں بھلا کیا کر سکتا ہوں۔ صرف ایک بے چین اور مضطرب جان رکھتا ہوں، قوت عمل مفقود ہے، ہاں! یہ آرزو رہتی ہے کہ کوئی قابل نوجوان جو ذوق خداداد کے ساتھ قوت عمل بھی رکھتا ہو مل جائے جس کے دل میں اپنا اضطراب منتقل کر دوں"۔

صوفیاء اور علماء کے بارے میں ایک واضح نظریئے کا اظہار اور کسی

صاحب ذوق اور صاحب عمل نوجوان کے دل میں اپنا اضطراب منتقل کرنے کی آرزو اور تڑپ بذات خود ایک اجتہادی رویہ ہے۔ ان کے دل میں جو اضطراب تھا وہی ان کا اجتہاد تھا۔ اس کی تشریح اس خط سے بھی ہوتی ہے جو اقبال نے ۲۰ر جولائی ۱۹۳۷ء کو چودھری نیاز علی کو لکھا: (اقبال اس خط کی تاریخ سے صرف نو مہینے کے اندر اندر رحلت کر گئے)

"......علماء میں مداہنت آ گئی ہے۔ یہ گروہ حق کہنے سے ڈرتا ہے۔ صوفیاء اسلام سے بے پروا اور حکام کے تصرف میں ہیں۔ اخبار نویس اور آج کل کے تعلیم یافتہ لیڈر خود غرض ہیں اور ذاتی عزت اور منفعت کے سوا کوئی مقصد ان کی زندگی کا نہیں۔ عوام میں جذبہ موجود مگر کوئی ان کا بے غرض رہنما نہیں ہے"۔

گرامی کے نام ایک اور خط میں دیکھئے علامہ نے اپنی شخصیت کے کیا لطیف گوشے نمایاں کئے ہیں اور قرآن حکیم کو جس انداز سے دیکھا ہے وہ انداز اجتہادی ہے کیوں کہ عام طور سے مسلمان قرآن کی تلاوت اور اسے غلاف میں رکھ کر رحل کی زینت بنانے پر مطمئن ہیں اور سمجھتے ہیں کہ انہوں نے مسلمان ہونے کا حق ادا کیا:

"قرآن شریف سے مسلمانوں کی آئندہ تاریخ پر کیا روشنی پڑتی ہے اور جماعت اسلامیہ، جس کی تاسیس دعوت ابراہیمی سے شروع ہوئی، کیا کیا واقعات و حوادث آئندہ صدیوں میں دیکھنے والی ہے اور بالآخر ان سب واقعات کا مقصود و غایت کیا ہے، میری سمجھ اور علم میں یہ تمام باتیں قرآن شریف میں موجود ہیں اور استدلال ایسا صاف و واضح ہے کہ کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ تاویل سے کام لیا گیا ہے۔

یہ اللہ تعالیٰ کا خاص فضل ہے کہ اُس نے قرآن شریف میں یہ مخفی علم مجھ کو عطا کیا ہے۔ میں نے پندرہ سال تک قرآن پڑھا ہے اور بعض آیات وسورتوں پر مہینوں غور کیا ہے اور اتنے طویل عرصے کے بعد مندرجہ بالا نتیجے پر پہنچا ہوں۔

فنا اور بقا کے مسئلے پر دیکھئے علامہ کس طرح اجتہاد کی بات کرتے ہیں:

"جب احکام الٰہی خودی میں اس حد تک سرایت کر جائیں کہ خودی کے پرائیویٹ امیال وعواطف باقی نہ رہیں اور صرف رضائے الٰہی اس کا مقصود بن جائے تو زندگی کی اس کیفیت کو بعض اکابر صوفیائے اسلام نے فنا کہا ہے۔ بعض نے اسی کا نام بقا رکھا ہے۔ لیکن ہندی اور ایرانی صوفیا میں سے اکثر نے مسئلہ فنا کی تفسیر فلسفہ ویدانت اور بدھ مت کے زیر اثر کی ہے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمان اس وقت عملی اعتبار سے ناکارہ محض ہے۔ میرے عقیدے کی رو سے یہ تفسیر بغداد کی تباہی سے بھی زیادہ خطرناک تھی اور ایک معنی میں میری تمام تحریریں اسی تفسیر کے خلاف ایک بغاوت ہے"۔

(مولوی ظفر احمد کے نام خط مورخہ ۱۲ر دسمبر ۱۹۳۶ء)

اپنے خطبات میں اقبال نے جس فکری اجتہاد سے کام لیا ہے اس کی سطح بیشتر کے فکر سے بہت بلند ہے۔ وہ محض فقہی مسائل سے متعلق اجتہادِ نظر نہیں بلکہ بقائے اسلام سے متعلق اور منسلک تفکر کا آئینہ دار ہے۔ وہ صرف دین کو اپنانے کے روادار نہیں، حکمت دین سے بہرہ ور ہونے کے طرفدار ہیں۔ علامہ کی نظر میں ذکر و فکر (ذکر سے مطلب ذکر الٰہی اور فکر سے مطلب موجود وجود پر فکر) کے اتحاد سے دل و دماغ کی تہذیب کی جاسکتی ہے منفرد طور پر یہ حق ان سے ادا نہیں ہوسکتا: اس

کے برعکس صوفیا نے عام طور صرف 'ذکر' کو اولی و اعلیٰ سمجھا۔

اجتہادی لہر کا ایک تموج یہ بھی ہے:

"اب اگر کوئی معاشرہ حقیقت مطلقہ کے اس تصور پر مبنی ہے تو پھر یہ بھی ضروری ہے کہ وہ اپنی زندگی میں ثبات اور تغیر' دونوں خصوصیات کا لحاظ رکھے۔ اس کے پاس اس قسم کے دوامی اصول ہونا چاہئیں جو حیات اجتماعیہ میں نظم و انضباط قائم رکھیں کیوں کہ مسلسل تغیر کی اس بدلتی ہوئی دُنیا میں ہم اپنا قدم مضبوطی سے جما سکتے ہیں تو دوامی ہی کی بدولت۔ لیکن دوامی اصولوں کا یہ مطلب تو ہے نہیں کہ اس سے تغیر و تبدیلی کے جملہ امکانات کی نفی ہو جائے۔ اس لئے کہ تغیر وہ حقیقت ہے جسے قرآنِ پاک نے اللہ تعالیٰ کی ایک بہت بڑی آیت ٹھہرایا ہے۔ اس صورت میں تو ہم اس شئے کو' جس کی فطرت ہی حرکت ہے حرکت سے عاری کر دیں گے۔ اصول اول کی تائید تو سیاسی اور جتماعی علوم میں یورپ کی ناکامیوں سے ہو جاتی ہے' اصول ثانی کی عالم اسلام کے پچھلے پانچ سو برس کے جمود سے' جو اگر ٹھیک ہے تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ اسلام کی ہیئت ترکیبی میں وہ کون سا عنصر ہے جو اس کے اندر حرکت اور تغیر قائم رکھتا ہے۔ اس کا جواب ہے اجتہاد" (ترجمہ: اقتباس چھٹا خطبہ)

اقبال ساری عمر یہی اجتہاد کرتے رہے اور اس فلسفہ فعالیت کی ترویج و اشاعت کیلئے کوشاں رہے' جو مذہب اسلام کی روح ہے۔ وہ صحیح معنوں میں بالغ نظر اور صائب الرائے مجتہد تھے جس کا ثبوت ان کے خطبات ہیں۔ یہ بدقسمتی ہے کہ سارے ہی لوگ اقبال کی شاعری کے اسیر ہیں یا مخالف۔ شاعری میں بہت کچھ نہ سہی کچھ تو بروزن شعر یا برائے شعر گفتن کا معاملہ ہوتا ہے۔ کبھی کبھی ایک عظیم

شاعر کیلئے بھی قافیہ نبھانا ناگزیر ہو جاتا ہے بس اسی مقام سے "یاران طریقت" بات لے اڑتے ہیں۔ یہ بات اطمینان وسکون کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ اس صدی میں کوئی مفکر شاعر گزرا ہی نہیں اور آئندہ کوئی پیدا ہو تو اس کیلئے اقبال کا تتبع کرنا مخالفت میں یا حمایت میں' ناگزیر ہو گا۔ عجب یہ ہے کہ اقبال کی شاعری پر زیادہ توجہ ان کے فکر کے حوالے سے کی جاتی ہے' اُن کے فن شعر' اسلوب' ادا' صدا اور نوا پر غور نہیں کیا جاتا۔ لیکن جہاں ان سے مضبوط علمی اور فکری بنیادوں پر اختلاف یا اتفاق کیا جا سکتا تھا' وہ ان کے وہ افکار ہیں جو خطبات کی زینت ہیں مگر افسوس ان پر توجہ ہی نہیں کی جاتی۔ حقیقت ورنہ یہ ہے کہ ان خطبات کی اساس پر تحقیق وتلاش کے کئی نئے افق دریافت کئے جا سکتے ہیں۔ ایسا ہو جائے تو ہماری آنیوالی نسلوں کو راہ اور روشنی ملے گی۔

●●●

بذلہ سنج اقبال

''حسِ مزاح سے عاری اختیار و اقتدار خطرناک ہو سکتا ہے'' کے مقابلے میں یہ کہنا زیادہ صحیح اور برمحل ہے کہ حسِ مزاح سے عاری علم اور عالم خطرناک ہو سکتے ہیں۔ مزاح عامیانہ قسم کے ٹھٹھا مخول نہ ہو تو اس حزن و ملال کی گرد چھٹ جاتی ہے اور انسان کا دل سرخوشی سے کھل اٹھتا ہے۔ کسی بات میں ایسا لطیف پہلو پیدا کرنا جو اُس کی سنجیدگی میں تبسم کا ارتعاش پیدا کرے، جس سے موج رنگ سی دل سے گزر جائے، وہی مزاح ہے۔ اس کی دو عمدہ مثالیں تاریخ اسلام سے پیش کی جا سکتی ہیں۔

ایک یہ ہے کہ حضورؐ نے جب فرمایا کہ بوڑھی عورتیں جنت میں نہیں ہوں گی تو بوڑھی عورتوں نے پریشان ہو کر سبب دریافت کیا۔ حضورؐ نے متبسم ہو کر کہا وہ اس لئے کہ قیامت کے روز مرد و زن جوانی کے عالم میں اٹھائے جائیں گے۔ اسی طرح صحابہؓ ایک بار کھجور کھا رہے تھے اور از راہ مذاق گٹھلیاں حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے سامنے جمع کرتے جاتے تھے۔ کھجوریں ختم ہوئیں تو سب نے متعجب ہونے کے انداز میں کہا ''علی! آپ نے کتنے سارے کھجور کھائے اس کا اندازہ آپ کے سامنے گٹھلیوں کی ڈھیری سے ہوتا ہے''۔ حضرت علیؓ نے برجستہ جواب دیا ''آپ لوگوں نے گٹھلیوں سمیت کھجور ہضم کر لئے، میں نے تاہم گٹھلیاں الگ کیں''

اقبال کی تحریروں سے لگتا ہے کہ یہ شخص خاصا خشک مزاج، بارعب، سنجیدہ اور ناک پر مکھی نہ بیٹھنے دینے والا انسان رہا ہوگا۔ واقعہ البتہ یہ ہے کہ اقبال ہر رنگ میں رنگ جاتے تھے۔ درونِ خانہ وہ ایک اور ہی اقبال ہوا کرتے تھے، فلسفیوں اور

دانشوروں کے درمیان بیٹھنے والا الگ ہی قسم کا اقبال تھا' یاروں کے ساتھ جو اقبال اٹھتا بیٹھتا تھا وہ اور ہی قسم کا اقبال تھا۔ وہ محفل اور موقعہ کی مناسبت سے اپنی شخصیت کو ڈھالنے پر قادر تھے۔ یہ نفسیاتی طور پر ایک زبردست عزم وارادے کی مالک شخصیت کی نشانی ہے۔ اقبال کے مزاح کی مختلف سطحیں تھیں' جو چاچا خوشیا سے لے کر' جو اِن کے بچپن کے دوست تھے' بلگرامی تک کی سطح تک محیط تھیں۔ اس بارے میں چند ایک واقعات:

- کہتے ہیں شام کے کھانے کی ایک محفل میں ایک شخص (شاید نواب ذوالفقار) جو بے حد کالے تھے' کالے رنگ کا ڈنر سوٹ پہنے' تشریف لائے۔ علامہ نے ان سے پوچھا ''جناب آپ کیا ننگے ہی تشریف لائے ہیں''۔

- مولانا غلام قادر گرامی عمر میں اقبال سے دس بیس سال بڑے تھے مگر دونوں کے درمیان عمر کا تفاوت کبھی حائل نہیں ہوا۔ گرامی کیلئے اقبال ہمیشہ دیدہ و دل فرش راہ کئے رہتے تھے کیوں کہ وہ ان کے (گرامی کے) تبحر علمی کے قائل تھے۔ اس کے باوصف ان کے نام خطوں میں اقبال انہیں اس طرح چھیڑتے نظر آتے ہیں کہ تبسم زیر لب رواں ہو ہی جاتا ہے۔ یہی کیفیت دراصل بذلہ سنجی کہلاتی ہے۔ دیکھئے گرامی سے لاہور نہ آنے کا شکوہ کس انداز سے کرتے ہیں۔

''اس پیشگوئی کے لئے کہ گرامی لاہور کبھی نہ آئے گا' کسی پیغمبر کی ضرورت نہیں۔۔ جالندھر اور ہوشیار پور کا ہر شیر خوار بلا تامل ایسی پیشگوئی کرسکتا ہے''

- ایک اور خط میں گرامی کو لکھا:

''بندۂ خدا کبھی کبھی اپنی خیریت سے تو مطلع کر دیا کرو۔

بوڑھے ہو کر جوانانِ رعنا کی ناز فرمائیاں، چہ معنی دارد"!

ہلکے پھلکے انداز میں بوڑھاپے کی تفسیر کس انداز سے کی

"گرامی سال خوردہ ہے یعنی سالوں اور برسوں کو کھا جاتا ہے۔ پھر بوڑھا کیوں کر ہو سکتا ہے۔ بوڑھا تو وہ ہے جس کو سال اور برس کھا جائیں"۔

گرامی سے اقبال کی محبت کا یہ عالم تھا کہ گرامی کے نامہ و پیام میں تاخیر ان کو ناگوار گزرتی تھی اسی لئے انہیں چھیڑتے رہتے تھے:

"آپ کہاں ہیں، حیدر آباد میں یا عدم آباد میں۔ اگر عدم آباد میں ہیں تو مجھے مطلع کیجئے کہ میں آپ کو تعزیت نامہ لکھوں"

گرامی کی شکایت خان نیاز الدین سے اِن الفاظ میں کرتے ہیں:۔

"گرامی صاحب نے وعدہ کیا تھا کہ محرم میں تشریف لائیں گے مگر الکونی لا یوفی۔

اب معلوم نہیں کہاں تشریف رکھتے ہیں۔ گرامی صاحب تو امام غائب ہو گئے۔ معلوم نہیں اس غیبت صغریٰ کا زمانہ کب ختم ہوگا"۔

● فقیر سیّد وحید الدین (روزگار فقیر حصہ اول میں) لکھتے ہیں کہ "میرا طالب علمی کا زمانہ تھا کہ پہلی ہی ملاقات میں میں نے علاوہ اور باتوں کے حضرت علامہ سے یہ بھی کہہ دیا کہ انگلستان پہنچ کر لوگ اپنے نام فرنگیانہ بنا لیتے ہیں، آپ کو بھی چاہئے تھا کہ اپنا نام 'AKBall' رکھ لیتے۔ اقبال نے بلا تامل جواب دیا "بھئی ہم نے تو ایسا نہیں کیا مگر تم ولایت جاؤ تو اُس نسخے پر ضرور عمل کرنا اور اپنا نام 'WAheed' رکھ لینا"۔

● غالب ہی کی طرح اقبال کو بھی آموں سے رغبت تھی۔ ایک مرتبہ

اکبرالہٰ آبادی نے ان کے لئے 'لنگڑا آم' بھجوائے۔ اقبالؒ نے رسید کے طور پر یہ شعر لکھ بھیجا ۔

اثر یہ تیرے اعجاز مسیحائی کا ہے اکبر
الہٰ آباد سے لنگڑا چلا لاہور تک آیا

● اقبالؒ نے ایک بار چند دوستوں کو کھانے پر بلایا۔ انہوں نے کھانے کی خوب تعریف کی۔ کچھ دنوں کے بعد نواب ذوالفقار علی نے' جو اقبال کے یہاں کھانے میں موجود تھے' دعوت کا اہتمام کیا اور اقبال سے کہا کہ وہ اپنے خانساماں' کو کھانے پکانے کیلئے بھیج دیں یا اس کا پتہ بتائیں۔ اقبال نے انہیں لکھا ''بھائی میں تو غریب آدمی ہو۔ کھانا وغیرہ میری بیگم خود پکاتی ہیں اور پھر اپنی بیگم کو یہ واقعہ سُناتے ہوئے اُس سے کہا:

سن تو سہی جہاں میں ہے تیرا فسانہ کیا

نواب ذوالفقار علی' جوگندر سنگھ اور دوسرے دوستوں کے ساتھ علامہ کی بے تکلفانہ گفتگو میں ان کی بذلہ سنجی کے نہ جانے کتنے واقعات رونما ہوئے ہوں گے جو سب کے سب بد قسمتی سے ضبط تحریر میں نہیں آئے ہیں۔ اس اجمالی ذکر سے ایک تو اس باب میں تحقیق کے لئے تشویق دلانا ہے اور دوسرا یہ بات بتانا کہ اقبالؒ کوئی خشک قسم کے چڑ چڑے مزاج کے آدمی نہیں تھے' جو مزاج اکثر فلسفیوں اور بڑے آدمیوں کی خاصیّت اور خصوصیّت ہوتا ہے۔ وہ زندگی کو زندہ دلوں کی طرح گذارتے تھے اور یاروں کے یار تھے' جن سے وہ بہت کچھ سنتے تھے اور جن کو وہ بہت کچھ سناتے تھے' جس سے زندگی ان کی محفلوں میں قوس قزح کے رنگ بکھیرتی ہوتی نظر آتی تھی۔

●●●

اساتذہ کے حضور میں

علامہ اقبال کی ابتدائی تعلیم حسب دستور زمانہ مکتب سے شروع ہوئی۔ مسجد شوالہ میں واقعہ اُن کے مکتب کے اُستاد مولوی غلام حسین تھے۔ اُس کے بعد مشن ہائی اسکول سیالکوٹ میں ان کی تعلیم کا سلسلہ جاری رہا یہاں تک کہ انہوں نے ایف۔اے کا امتحان پاس کیا۔ بی۔اے کا امتحان گورنمنٹ کالج لاہور سے پاس کیا۔

سیالکوٹ میں ان کی تعلیم کا زمانہ ان کی ذہنی تربیت کا زمانہ تھا کیوں کہ یہیں انہیں میر حسن جیسا نابغہ روزگار استاد ملا۔ میر حسن نے اقبال کو علوم مشرقی میں (بطور خاص فارسی اور عربی میں) دسترس حاصل کرنے کے قابل بنایا۔ اس کے علاوہ میر حسن نے اپنی ذات کے توسط سے اقبال کو شرافت نفس، خودی، خودداری اور اقدار عالیہ کی آبیاری کے رموز سے آگاہ کیا۔ اپنے اس استاد سے اقبال کو اتنی عقیدت تھی کہ اُن کے مکتب کو آستاں اور اس آستاں کو مثل حرم سمجھتے تھے:

وہ شمع بارگہہ خاندان مرتضوی
رہے گا مثلِ حرم جس کا آستاں مجھ کو
نفس سے جس کے کھلی مری آرزو کی کلی
بنایا جس کی مروّت نے نکتہ داں مجھ کو

(التجائے مسافر)

میر حسن سے دِلی لگاوٗ اور اُن کی ذات سے عقیدت یا اپنے عقیدے کے اظہار میں نہ جانے اقبال نے کیا کچھ کیا یا کہا کہ اُن کی رحلت پر خواجہ حسن نظامی

نے تعزیتی شذرہ میں لکھا:

"وہ چونکہ محب اہل بیت تھے اور تفضیلی عقائد رکھتے تھے اس لئے قدرت نے ان کو چہلم سید الشہدا سے ایک دن پہلے کی تاریخ عطا فرمائی"

اقبال وسیع المسلک بھی تھے اور وسیع المشرب بھی اور عقائد کے معاملہ میں جاوید کے نام وصیت میں وہ یہ لکھ کر چھوڑ گئے:

......دینی معاملہ میں صرف اس قدر کہنا چاہتا ہوں کہ میں اپنے عقائد میں بعض جزوی مسائل کے سوا، جو ارکان دین میں سے نہیں، سلف صالحین کا پیرو ہوں اور یہی راہ بعد کامل تحقیق کے محفوظ معلوم ہوتی ہے"

اپنے استاد سے اقبال کی عقیدت کا یہ عالم تھا کہ جب انہیں ۱۹۲۲ء میں 'نائٹ ہڈ' کی پیشکش کو منظور کرنے کا مرحلہ پیش آیا تو انہوں نے دوٹوک الفاظ میں کہا "میں اس خطاب کو صرف اس صورت میں قبول کر سکتا ہوں کہ میرے استاد میر حسن کو شمس العلماء کا خطاب دیا جائے" اِس پر پوچھا گیا کہ کیا میر صاحب کی کوئی تصنیف ہے تو اقبال نے جواب دیا "میں ان کی زندہ تصنیف ہوں"۔ اس ایک جملے نے میر حسن کو شمس العلماء بنا دیا جو خطاب انہیں ۱۹۲۴ء میں ملا۔ "خدوخال اقبال" کے مصنف نے اس واقعہ میں یہ شک وارد کیا ہے کہ میر حسن کے فرزند سید علی نقی شاہ گورنر ہاؤس میں ڈاکٹر تھے اور ظاہر ہے کہ ایک اثر ورسوخ کے مالک تھے، وہ خود اپنے والد کا نام تجویز کر سکتے تھے۔ مزید یہ کہ میر حسن کے کئی شاگرد جن میں تحصیلداروں سے لے کر جج ہائی کورٹ تک کے منصب دار شامل تھے، وہی ان کے نام کی سفارش کر سکتے تھے، اقبال کو زحمت اٹھانے کی کیا ضرورت تھی؟ اس استدلال کو ماننے میں دو وجوہ مانع ہیں۔ اولاً یہ کہ اُن تحصیلداروں اور ججوں کے نام نہیں دیئے گئے ہیں جو

میر صاحب کے شاگرد رہے تھے اور ان سے اتنی ہی عقیدت رکھتے تھے جتنی عقیدت اقبال کی ان کی ذات سے تھی۔ ثانیاً یہ استدلال سرکاری قانون وقواعد سے مصنف کی مطلق بے خبری کا ثبوت ہے۔ خطابات دینے کے معاملہ میں، برٹش گورنمنٹ میں کیا، ہماری جمہوری حکومتوں میں بھی، یہ دستور نہیں کہ تحصیلداروں یا ہائی کورٹ کے ججوں سے سفارشات طلب کی جائیں۔ نہ یہ معاملہ کالج کے پرنسپلوں یا گورنر ہاؤس کے ڈاکٹروں کے دائرہ کار میں آتا تھا (ہے) اس پر مستزاد کہ سفارش کنندہ خطاب پانے والے کا فرزند ارجمند ہوتا (ہو)۔ یہ آج کل کا زمانہ نہیں تھا کہ منسٹروں کے پرائیویٹ سکریٹری اور باورچی خطابات کی سفارش کرتے پھریں۔ برٹش دور میں خطابات بڑی تحقیق، غور وخوض اور تجسس کے بعد دیئے جاتے تھے، جس میں سرکاری خفیہ ایجنسیوں کی رپورٹ بھی شامل رہتی یا اقبال جیسی علمی، ادبی اور سیاسی شخصیت کی سفارش کا لحاظ رکھا جاتا تھا۔ اقبال کی اپنی حیثیت یہ تھی کہ حکومت کو انہیں 'سر' کا خطاب پیش کرنا پڑا اور میر حسن کی یہ حیثیت تھی کہ انہیں ان کے شاگرد جانتے تھے، حکومت کے ایوانوں میں ان کے نام اور کام سے کوئی واقف نہیں تھا۔ بہر حال یہ سب کہنے اور سننے کے بعد یہ حقیقت قائم ودائم رہے گی کہ اقبالؒ نے اپنے استاد کے نام کو چار چاند لگائے اور بقائے دوام بخشا۔ جب تک اقبال کا نام لیا جائے گا، میر حسن کا نام بھی ایک لاحقہ کے طور پر سامنے آتا جائے گا۔

اقبال کے ایک اور استاد پروفیسر آرنلڈ تھے جو محمڈن اینگلو اورینٹل کالج، علی گڑھ میں فلسفہ کے پروفیسر تھے۔ وہ ۱۸۸۹ء میں علی گڑھ سے ریٹائر ہوئے تو ۱۹۰۴ء تک گورنمنٹ کالج لاہور میں فلسفہ کے استاد رہے، جس کے بعد وہ اپنے وطن انگلستان لوٹے۔ اقبال اسی کالج میں ۱۸۹۸ء میں بی۔ اے کی جماعت میں طالب علم کی حیثیت میں داخل ہوئے اور آرنلڈ کے شاگرد ہو گئے۔

پروفیسر آرنلڈ نے اقبال کے اندر فلسفہ کا شائستہ اور ستھرا مذاق پیدا کیا اور اقبال کو مطالعہ اور مشاہدہ کے ذریعہ تازہ ہواؤں کیلئے اپنے دل و دماغ کے دریچے کھول دینے کی تحریک و تشویق دی۔ آرنلڈ ایک علم دوست، وسیع المشرب اور علم و ادب پر گرفت رکھنے والے ایسے استاد تھے کہ ان کے مکتب سے بے خبر لوگ باخبر ہو کر اٹھتے تھے۔ آرنلڈ ہی نے اقبالؒ کے اندر چھپے ہوئے مفکر اور فلسفی کو بھانپ لیا اور اس کی بہتر تراش خراش اور ترتیب و تہذیب کو یقینی بنانے کیلئے اسے یورپ جانے کا مشورہ دیا۔ اقبال نے استاد کا پرخلوص مشورہ ماننے میں ذرا دیر نہ لگائی اور ۱۹۰۵ء میں یورپ کے لئے روانہ ہو گئے۔ اسی سفر میں اقبال نے کیمبرج سے تعلیم بھی حاصل کی اور کیمبرج میں معلمی بھی کی۔ انہی پروفیسر آرنلڈ کی یاد میں اقبال نے "نالۂ فراق" کے عنون سے نظم لکھی جس میں اعتراف کیا کہ ۔

ذرّہ میرے دل کا خورشید آشنا ہونے کو تھا
آئینہ ٹوٹا ہوا عالم نما ہونے کو تھا
نخل میری آرزوؤں کا ہرا ہونے کو تھا
آہ کیا جانے کوئی میں کیا سے کیا ہونے کو تھا

ابر رحمت دامن از گلزار من برچید و رفت — اندکے بر غنچہ ہائے آرزو بارید و رفت

آرنلڈ کو کلیم ذروۂ سینائے علم کہہ کر اقبال نے ان الفاظ میں اسے خراج عقیدت پیش کیا۔

تو کہاں ہے اے کلیم ذروہ سینائے علم — تھی تری موج نفس باد نشاط افزائے علم
اب کہاں وہ شوق رہ پیمائی صحرائے علم — ترے دم سے تھا ہمارے سر میں بھی سودائے علم

☆ ☆

کھول دے گا دست وحشت عقدۂ تقدیر کو — توڑ کر پہنچوں گا میں پنجاب کی زنجیر کو

دیکھتا ہے دیدۂ حیراں تری تصویر کو کیا تسلی ہو مگر گرویدۂ تقریر کو

تاب گویائی نہیں رکھتا دہن تصویر کا

خامشی کہتے ہیں جسکو ہے سخن تصویر کا

یہی ہوا ۱۹۰۵ء میں اقبال پنجاب کی زنجیر توڑ کر لندن کیلئے روانہ ہوئے۔

اُستاد کے ساتھ عقیدت کا ماجرا ایک طرف چھوڑ کر اقبال کے یہ اشعار ان کے فن شعر اور تخیل کی شادابی اور سرشاری پر ان کی گرفت کا پتہ دیتے ہیں۔ کلیم ذروۂ سینائے علم' رہ پیمائی صحرائے علم' گرویدہ تقریر' خامشی سخن تصویر کی تراکیب کے پس پردہ جذبات اور وفورِ شوق کا کیا عالم چھپا ہوا ہے' یہ احساسات کے دنیا کی بات ہے۔

شاعری میں اقبال داغ کے شاگرد تھے۔ ہر چند کہ تلامذہ کا عرصہ ۱۸۹۲ء میں شروع ہو کر کچھ ہی برسوں میں ختم ہو گیا کیوں کہ داغ نے ان کے کلام میں اصلاح کی گنجائش نہیں دیکھی اور عالی ظرفی اور اخلاص کا ثبوت دیتے ہوئے اقبال کو اس سے آگاہ کیا۔ آج کے دستور کے مطابق وہ اقبال کو فارغ الاصلاح' قرار ہی نہیں دیتے تا کہ معاملات چلتے رہتے۔ بہر حال داغ کے تلمذ میں اقبال کو جو سب سے بڑا فائدہ ہوا وہ ان کا شعری زبان سے کماحقہ' واقف ہونا تھا۔ وہ اس سے تاعمر فائدہ اٹھاتے رہے۔ اسی لئے اقبالؒ اپنے استاد کا ذکر عقیدت و احترام سے کرتے تھے:

نسیم و تشنہ ہی اقبال کچھ اس پر نہیں نازاں

مجھے بھی فخر ہے شاگردیٔ داغ سخنداں پر

داغ کی وفات پر اقبالؒ نے ایک پر اثر اور جوش عقیدت سے بھرا 'مرثیہ' لکھا جو ان کے فن پر بھی دال ہے۔ اس مرثیہ کے چند اشعار :

؎ چل بسا داغ آہ! میت اس کی زیب دوش ہے

آخری شاعر جہاں آباد کا خاموش ہے

ے اب صبا سے کون پوچھے گا سکوت گل کا راز
کون سمجھے گا چمن میں نالہ بلبل کا راز

ے اور دکھلائیں گے مضموں کی ہمیں باریکیاں
اپنے فکر نکتہ آرا کی فلک پیمائیاں

ے ہو بہو کھینچے گا لیکن عشق کی تصویر کون
اٹھ گیا ناوک فگن مارے گا دل پر تیر کون

اشک کے دانے زمین شعر میں بوتا ہوں میں — تو بھی رو اے خاک دلی داغ کو روتا ہوں میں

وہ گل رنگیں تر رخصت مثال بُو ہوا — آہ خالی داغ سے کاشانہ اُردو ہوا

ان اساتذہ کے علاوہ اقبال کے دوسرے اساتذہ کا، جنہوں نے انہیں مثلاً انگریزی زبان سے ایسا متعارف کیا کہ انگریزی زبان میں تشکیل جدید الٰہیات اسلام (The reonstruction of Relegious Th ought in Islam) اور "Development of metaphysics in Persia" جیسی کتابیں لکھ سکے، کا کوئی ذکر نہیں ملتا۔ ہماری ناقص رائے میں اقبال کے دوسرے استاد کسی لحاظ سے کم مرتبے اور اہمیت کے حامل نہیں تھے۔ یقیناً انہوں نے بھی ان کی شخصیت کی تعمیر اور ان کے فکر و نظر میں وسعتیں پیدا کرنے کے جتن کئے ہوں گے۔ بہر حال اس بات کا مقصد صرف یہ واضح کرنا تھا کہ موجودہ ناہنجار زمانے میں، جسے لوگ علم اور سائنس کی ترقی کا دور کہتے ہیں، استادوں کے ساتھ عقیدت رکھنے کے بجائے، ان کی دستار اتارنے کی مذموم روایات قائم کی جا رہی ہیں۔ اقبالؒ کا رویہ اپنے استادوں کیساتھ اس لحاظ سے قابل تقلید ہے کہ انہوں نے اپنے استادوں کو، ان کی سماجی اور اقتصادی حیثیت سے نہیں صرف اپنے استادوں کی حیثیت سے اپنے دل میں یاد رکھا اور احسن طریقے سے موقعہ ملنے پر ان کا ذکر کیا۔

دوستوں کا دوست

"دانائے راز" کے مصنف سیّد نذیر نیازی صاحب نے اقبال کے بچپن اور جوانی کے جن بے تکلف دوستوں کا ذکر کیا ہے ان کی فہرست یوں مرتب کی جا سکتی ہے:

۱۔ جمشید علی راٹھور

۲۔ سید محمد تقی (فرزند میر حسن استادِ اقبال)

۳۔ نیاز الدین خان

۴۔ سید بشیر الدین حیدر

۵۔ آغا محمد باقر

۶۔ مولانا محمد ابراہیم

۷۔ ڈاکٹر محمد حسین شاہ

۸۔ رکن الدین

۹۔ کنور سین (لا کالج کے پرنسپل تھے اور جموں کشمیر میں چیف جسٹس کے عہدے پر فائز رہے)

۱۰۔ نہال سنگھ...... (پٹیالہ میں وزیر بن گئے)

۱۱۔ جدت سنگھ

۱۲۔ نرنجن داس

۱۳۔ کھڑک سنگھ (سیاستدان بن گئے)

۱۴۔ بیلی رام (باثر ہندو وکیل ہو گئے)

۱۵۔ مرزا بدر الدین

۱۶۔ چاچا خوشیا

۱۷۔ شیخ گلاب الدین

۱۸۔ چراغ ماسٹر

۱۹۔ مولوی محبوب عالم

۲۰۔ میر نیرنگ

۲۱۔ جھنڈے خان

اقبال کے بے تکلف دوستوں میں جوگندر سنگھ شعاء الملک حکیم محمد حسن، اور نواب ذوالفقار علی خاں بھی شامل تھے۔ ان کا ذکر اقبال نے اپنی ایک تہہ دار نظم میں اس طرح کیا ہے:

پتے کی ایک بات جوگندر نے یہ کہی

موڑھے ذوالفقار علی خاں کا کیا خموش

تذکروں میں آیا ہے کہ اقبال جب بھی لاہور سے سیالکوٹ جاتے تھے، تو چاچا خوشیا کے گھر ضرور جاتے تھے۔ ایک دن گئے تو چاچا خوشیا گھر پر نہیں تھے۔ اقبال ان کے گھر کے چبوترے پر بیٹھ کر ان کا انتظار کرتے رہے۔ یعنی جس آدمی کے انتظار میں مشاہیر بیٹھا کرتے تھے وہ بچپن کے ایک دوست چاچا خوشیا کے چبوترے پر بیٹھا اس کا انتظار کرنے میں کوئی سبکی محسوس نہیں کرتا تھا۔ چاچا خوشیا ایک بار لاہور آئے اور ایک جگہ سوڈا پی رہے تھے کہ ایک تانگہ رُکا اور تانگے سے علامہ اقبال نے اتر کر خوشیا کو آواز دی اور گھر لے گئے۔ خوشیا نے اس مفکر اور عظیم شاعر سے باتوں باتوں میں کہا "یار تو اب بڑا آدمی بن گیا ہے"۔ یہ انداز تخاطب! "دو لفظ یار......تو......" سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ باقی گفتگو کس انداز

میں ہوئی ہوگی۔ اقبال نے بچپن کے دوست پر اپنی شخصیت اور مرتبے کا کوئی رعب نہیں ڈالا اور اسے بچپن کے بے تکلف انداز میں گفتگو کرنے کی اجازت دی۔

اقبال کے تذکرہ نگاروں کے مطابق اقبال اپنے دوستوں سے اتنی محبت رکھتے تھے کہ وہ ان کے یہاں کسی بھی وقت آ جا سکتے تھے۔ ظاہر ہے کہ ان دوستوں میں سبھی اہل علم نہیں ہوا کرتے ہوں گے مگر ان کے لئے اقبال کی مجلس میں بیٹھنے کیلئے اس کی کوئی قید نہیں تھی بلکہ ان میں سے کچھ "یار تو" والا انداز اُس وقت بھی اپنائے رکھتے تھے، جب اقبال اہل علم و سیاست کے درمیان ہوتے۔ دوستوں کے بارے میں وہ اس قدر accomodative تھے کہ کچھ دوست دورانِ گفتگو بار بار ٹوکنے سے باز نہیں آتے تھے۔ اقبال اتنی دیر ٹھہر جاتے جب تک وہ اپنی بات کرتے۔ کشمیر میں کہاوت ہے کہ خدا جب کسی کو دولت دُنیا عطا کرتا ہے تو اسے پرانا مکان اور پرانے دوست اچھے نہیں لگتے اور وہ دونوں کو بدل دیتا ہے:

اسے کہ دولت دُنیا ملی ہے اب وہ بھی پرانے دوست، پرانا مکان بدلے گا

اقبال نے کبھی ایسا نہیں کیا۔ گھر تو عمر کے آخری دور میں انہوں نے نیا بنایا مگر دوست کبھی نہیں بدلے۔ کہیں یہ لکھا ہوا نہیں ہے کہ انہوں نے کبھی کسی دوست کو جھڑکا ہو یا اسے پہچاننے سے انکار کیا ہو یا اس کے تئیں بے تعلقی دکھائی ہو۔

اقبال کے دوست صرف مذکورہ بائیس آدمی ہی نہیں تھے۔ اقبال کی دوستی سینکڑوں عالم و فاضل شخصیتوں، سیاسی لیڈروں، سماجی منصب داروں، فلسفیوں، دینی رہنماؤں وغیرہ سے بھی تھی، تاہم ان کے ساتھ علامہ کی دوستی کا رنگ مختلف تھا۔ "یار۔ تو" والا دوست ان میں سے کوئی نہیں تھا۔ اس لئے اُن کے خطوط کی مدد سے یا دوسرے ذرائع سے ان دوستوں کے نام جمع کرنا فی الوقت ضروری نہیں۔ ورنہ

قائداعظم، جواہر لال نہرو اور ہز ہائینس آغا خان کے علاوہ کئی ریاستوں کے وزراء اور معتمد اُن کے جان پہچان والے دوستوں میں شمار کیے جاسکتے ہیں۔

اقبال کے دوستوں کے اس ذکر سے یہ واضح کرنا مقصود ہے کہ اقبالؒ پر دنیاداری کے رنگ نہیں چڑھے ہوئے تھے اور وہ تواضع اور انکسار کی عظیم روایتوں کی پاسداری کرتے تھے۔ ہمارے اپنے زمانے میں ہم دیکھتے ہیں کہ جو لوگ اقبال کی جوتیاں سیدھی کرنے کے قابل بھی نہیں، انہیں وسیع تر معنوں میں ذرا سی دولت دنیا مل جاتی ہے تو وہ دوستوں کے ساتھ کتنا برا سلوک کرتے ہیں۔ ان کی ترقی کے بارے میں ان کی محض خیر خواہی تو درکنار، وہ ان کے راستوں میں کانٹے بچھانے سے بھی باز نہیں رہتے۔

●●●

اقبال اور ''خاکِ ارجمند''

اقبال چونکہ کشمیری الاصل تھے اِس لئے کشمیریوں کے ساتھ اُن کا قربت محسوس کرنا فطری تھا۔ اِسی فطری جذبے کے تحت انہوں نے ۱۸۹۶ء میں انجمن کشمیری مسلمانان لاہور کی رکنیت اختیار کی۔ انجمن کے نام ہی سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ لاہور میں رہنے والے کشمیریوں نے نہیں، بلکہ کشمیری الاصل شہریوں نے اپنے مقامی مسائل اور معاملات طے کروانے کیلئے اس انجمن کا قیام عمل میں لایا ہوگا۔ اس انجمن کے ذریعہ اس کے بانیوں نے اپنی ایک شناخت اور پہچان قائم کرنے کی جو سعی کی وہ یقیناً بلیغ تھی۔

کشمیر کی تاریخ صدیوں کی تاریخ کا ماجرا ہے، جس کے ڈانڈے مہابھارت سے پہلے کے زمانے سے ملتے ہیں۔ روایات کے مطابق کشمیر میں اس وقت بھی انسانی آبادی موجود تھی جب شری رام جی یہاں آئے تھے۔ جیالوجکل اور لسانی تحقیق کے ساتھ ساتھ اساطیری روایات کے حوالے سے کہا جاتا ہے کہ ہزاروں سال پہلے کشمیر سینکڑوں فٹ گہری ایک جھیل کی صورت میں تھا جس کی دریافت پر اسے ''ستی سر'' کا نام دیا گیا۔ یہاں سب سے پہلے جو باضابطہ حکومت قائم ہوئی وہ سورج بنسی خاندان کی تھی، جس کے پہلے راجا دیا کرن تھے۔ دیا کرن کی پشت سے پچپن (۵۵) راجا ہوئے۔ دیا کرن کا پہلا جانشین گونندا تھا جس کی حکومت مہابھارت کے یدھ سے بیس برس پہلے قائم ہوئی۔ گونندا کا بیٹا ابھی صغرسن ہی تھا کہ تخت نشین ہوا۔ اس کی صغرسنی کا لحاظ رکھتے ہوئے مہابھارت کی جنگ میں نہ کوروؤں نے اور نہ پانڈوؤں نے اس سے کوئی اعانت طلب کی۔

سورج ونشیوں کے بعد پانڈو خاندان نے کشمیر پر قدم جمائے۔ پانڈوؤں کے بعد موریہ خاندان برسر اقتدار آیا۔ اشوکا دی گریٹ وہی اشوکا ہے جس نے ٹیکسلا میں رہتے ہوئے اپنے ایک نائب کو امور سلطنت انجام دینے کیلئے رکھا۔ موریہ خاندان کے بعد کشن خاندان، گوند یا خاندان، کارکوٹا خاندان، اتپالا خاندان، لوہارا خاندان اول و دوم، کشمیر میں سریر آرائے سلطنت رہے۔ باضابطہ حکومتوں کا یہ سلسلہ ۱۱۱۱ء تک چلا جس کے بعد کے دو سو سال کا زمانہ خانہ جنگیوں کی داستان ہے۔ ۱۳۰۵ء میں تاتاری حکمران ذوالقدر خان نے کشمیر پر حملہ کر کے یہاں ایسی تباہی مچائی کہ تاریخ مثال پیش کرنے سے عاجز ہے۔ راجا سہادیو، جو اس وقت کشمیر کا راجا تھا، بھاگ گیا۔ اُس کی جگہ مغربی تبت (لداخ) کے راجا کا بیٹا، رینچن شاہ بادشاہ بن گیا۔ یہی رینچن مسلمان ہو گیا اور صدرالدین اپنا نام رکھا۔ سلطان صدرالدین ۱۳۲۶ء میں فوت ہوا۔ ۱۳۴۱ء میں صدرالدین کے وزیر سوات کے شاہ میرؒ نے سلطان شمس الدین کا لقب اختیار کر کے تخت پر قبضہ کر لیا۔ شاہ میر سے ہی سلاطین کشمیر کا دور شروع ہوا۔

سلاطین کا زمانہ کشمیر کی تاریخ کا بہترین زمانہ قرار دیا جاتا ہے۔ سلاطین میں سلطان شہاب الدین اور سلطان زین العابدین کے اسمائے گرامی شامل ہیں۔ سلاطین کی تاریخ کشمیریوں کی علم پروری، صنعت گری، بہادری، مذہبی رواداری اور تعمیر و ترقی کی منہ بولتی تصویروں کا البم ہے۔ جاوید نامہ میں اقبال نے سلطان شہاب الدین کو مشاہیر عالم میں شمار کر کے، اِن الفاظ میں اُن کا ذکر کیا ہے۔

عمر ہا گل رخت بربست و کشاد
خاکِ ما دیگر شہاب الدین نزاد

نالۂ پُر سوزِ آں مرغِ سحر
داد جانم را تب و تابِ دگر
تا یکے دیوانہ دیدم در خروش
آنکہ برد از من متاع صبر و ہوش

سلاطین کے بعد چک کشمیر کے حکمران بنے اور کشمیر کا آخری خودمختار بادشاہ یوسف شاہ چک، جسے 'اکبر اعظم' نے فریب دے کر قیدی بنا لیا، اسی خاندان سے تھا۔ یہ زمانہ ۱۵۸۶ء کا تھا۔ مغلوں کے بعد افغان کشمیر پر قابض ہوئے، افغانوں کے بعد سکھ آئے اور سکھوں کے بعد ڈوگروں نے اس شریف، چرب دست اور تر دماغ قوم کو محکوم بنا لیا۔

اقبال یقیناً اس امر سے واقف رہے ہوں گے کہ ایک زمانہ تھا جب شہنشاہ ابراہیم لودھی بھی سلطان زین العابدین کے یہاں پناہ گزیں بن کر رہا۔ جب خدیو مصر اور شریف مکہ بھی سلطان کو تحفے تحائف بھیجا کرتے تھے۔ جب گجرات کا بادشاہ سلطان کو نذرانے بھیجتا تھا۔ جب کشمیری پنجاب و قندھار کی سرحدوں کو روندتے ہوئے اپنا وجود واضح اور ثابت کر رہے تھے۔ انہیں معلوم رہا ہوگا کہ کشمیر ایک زمانے تک علوم و فنون کا مرکز تھا، جہاں ہندوستان ہی سے نہیں عراق و ایران سے لوگ تحصیل علم کیلئے آتے تھے۔ انہیں یاد آتا ہوگا کہ کشمیر، جس سے ان کا تعلق تھا، دُنیا بھر میں پہلا ملک تھا جہاں اقامتی یونیورسٹی اور درس گاہیں قائم کی گئی تھیں، جن میں صرفیؔ، فانیؔ اور ملا احمد جیسی دیو قامت علمی اور دینی شخصیتیں درس دیتی تھیں۔ ان کے سامنے غنیؔ عالم تصور میں نغمہ خواں رہتے ہی ہونگے کہ جاوید نامہ میں ان کے متعلق کہنا پڑا۔

؎ شاعر رنگیں نوا طاہر غنی
فقر او باطن غنی ظاہر غنی

اِن سارے حقائق اور پھر اس تظلم، تشدد، جبر اور ظلم کو یاد کر کے جو مغلوں، افغانوں اور سکھوں نے بلا لحاظ مذہب وملت، کشمیریوں پر ڈھائے ان کے دل پر یقیناً آرے چلتے ہوں گے اسی لئے "ملازادہ ضیغم لولابی کشمیری کا بیاض" کے تحت کہا ؎

آج ! وہ کشمیر ہے محکوم و مجبور و فقیر
کل جسے اہل نظر کہتے تھے ایران صغیر
آہ! یہ قوم نجیب و چرب دست و تر دماغ
ہے کہاں روز مکافات اے خدائے دیر گیر

اس آہ میں اقبال کے دل کا سوز اور درد ابھر کر آیا ہے۔ یہ دو شعر کشمیر کی پوری تمدنی اور تہذیبی تاریخ کے بیان کا حق ادا کرتے ہیں۔ اگر یہ کہنا مبالغہ ہے جب بھی بجا اور برمحل ہے۔ اس بیاض کے تحت اقبال نے انیس نظموں اور غزلوں کے اشعار کے ذریعہ کشمیریوں کو عمل اور اپنی بازیافت کرنے کا پیغام دیا ہے

گرم ہو جاتا ہے جب محکوم قوموں کا لہو ؎ تھرتھراتا ہے جہان چار سو و رنگ و بو
نکل کر خانقاہوں سے ادا کر رسم شبیری ؎ کہ فقر خانقاہی ہے فقط اندوہ و دلگیری
جس خاک کے ضمیر میں ہو آتش چنار ؎ ممکن نہیں کہ سرد ہو وہ خاک ارجمند
حاجت نہیں ہے خطہ گل شرح و بیاں کی ؎ تصویر ہمارے دل پرخوں کی ہے لالہ
سرما کی ہواؤں میں ہے عریاں بدن اسکا ؎ دیتا ہے ہنر جسکا امیروں کو دو شالہ

اِن اشعار سے واضح ہو جاتا ہے کہ لالہ زاروں، مرغزاروں، آبشاروں، کوہساروں، نغمہ ریز ندیوں نالوں، عطر بیز ہواؤں، قلقل کرتے ہوئے چشموں، سایہ افگن بیدزاروں، آتش درنفس چناروں، آسمانوں کو چھوتے ہوئے سفیدوں کی قطاروں اور دیوداروں، جہلم جیسے خسروانہ چال اور انداز سے بہنے والے دریا کے

مامن، مانسبل، آنچار، ولر اور ڈل جیسی آئینہ رو جھیلوں، تراگہ بل، پہلگام اور گلمرگ اور سونہ مرگ کی اونچائیوں کی اس سرزمین کے ساتھ اقبال کا تعلق دل و ذہن کی پہنائیوں میں رچا بسا تھا۔ اس لئے کشمیر کو 'خاک ارجمند' کے نام سے یاد کیا ہے۔

علامہ اقبال کو کشمیر سے ان کے ایک بے لوث مداح، رئیس بارہمولہ، خواجہ عبدالصمد ککرو کے توسط سے قریب کا تعلق تھا۔ خواجہ عبدالصمد صرف رئیس نہیں تھے بلکہ عالم و فاضل قسم کی شخصیت تھے اور شاعری میں مقبل تخلص کرتے تھے۔

افتتاح الکلام بسم اللہ الذی لیس فی الوجود سواہ
قل ہو اللہ و ہو احد الذی لم یلد و لم یولد
بعد حمد خداست نعت رسول کہ از و پیہم مقبل و مقبول
مصطفیٰ ماہ صحابہ چوں انجم رضی اللہ تعالیٰ عنہم

یہ اشعار مقبل کی عربی سے واقفیت اور فن شعر پر ان کی گرفت کے آئینہ دار ہیں۔ مقبل کے ساتھ علامہ کے تعلق خاطر کا اس سے بڑا کیا ثبوت ہوگا کہ ۱۹۲۱ء میں جب خواجہ صاحب فوت ہو گئے علامہ ان کے خاندان سے تعزیت کرنے کیلئے کشمیر تشریف لائے۔ اس سے پہلے جب خواجہ عبدالصمد ککرو کے بیٹے غلام حسن عین عنفوان شباب میں فوت ہوئے تو علامہ نے باضابطہ مرثیہ کہا اور اسے رسالہ مخزن میں چھپوایا۔ اس مرثیہ کے تین شعر یوں ہیں۔

اندھیرا صمد کا مکاں ہو گیا وہ خورشید روشن نہاں ہو گیا
غضب ہے غلام حسن کا فراق کہ جینا صمد کو گراں ہو گیا
دیا چن کے وہ غم فلک نے اسے کہ مقبل سراپا فغاں ہو گیا

ہر چند کہ یہ اشعار علامہ کے اسلوب اور فکر کے غماز نہیں اور صاف دکھائی دیتا ہے کہ تمام عجلت میں لکھے گئے ہیں، تاہم ککرو صاحب سے ان کے تعلقات

کے عکاس ضرور ہیں۔

خواجہ عبدالصمد کے علاوہ بھی سیاسی یا سماجی سطح پر علامہ کا کسی کشمیری سے کوئی قریبی تعلق رہا ہو، معلوم نہیں۔ علامہ کے عوارض جسمانی نے ۱۹۳۲ء کے آس پاس ان کی سرگرمیوں پر کافی اثر ڈالا تھا اور اس زمانے میں کشمیر میں کوئی زبردست سیاسی ہلچل بھی نہیں تھی کہ جس کے حوالے سے وہ کشمیری سیاست میں دلچسپی لیتے۔ انہوں نے کسی سیاسی لیڈر کو اپنا اعتماد بخش کر اسے کوئی سیاسی عمل اپنانے کا مشورہ دیا ہو، اس کی بھی کوئی شہادت نہیں ملتی لیکن یہ ظاہر ہے کہ کشمیر کی عظمت پارینہ کی بازیافت ان کی آرزو تھی۔ المختصر بقول ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی:

"کشمیر جنت بے نظیر سے اقبال کے وجود معنوی کو کچھ ایسا گہرا رابطہ ہے کہ اگر ہم اقبال کی شخصیت اور شاعری کو علامتی صورت میں دیکھنا چاہیں تو تخیل میں وادی کشمیر کے جلیل و جمیل نقوش ابھرتے ہیں۔ اس کے برف پوش، پُرجلال کوہسار اقبال کے فکر روشن کی تابناک رفعتوں کے عکاس ہیں اور اس کی گل بدامن و پُربہار وادیاں کلام اقبال کی شعری وفنی رنگینیوں کی آیئنہ دار......... اور کیوں نہ ہو کہ اقبال خود بھی تو اسی گلشن کا گلِ سرسبد ہے۔

"تنم گلے ز خیابان جنت کشمیر"
دل از حریم حجاز و نواز شیرازست

●●●



IQBAL INSTITUTE

UNIVERSITY OF KASHMIR
SRINAGAR.

